ماہنامہ
مجلہ
حیاتِ نو
بلریا گنج

ہم مسلمان قوم ہیں محض ایک قوم نہیں ہیں ہمیں آزادی
ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے درکار ہے اور
مسلمان قوم کی حیثیت سے آزادی کا مطلب یہ
ہے کہ ہم جہاں انفرادی حیثیت سے خدا کی بندگی
کیلئے آزاد ہوں وہاں بحیثیت قوم کے خدا کے احکام
کی اطاعت کرنے کیلئے بھی آزاد ہوں اور یہ اسی صورت
میں ممکن ہے جب ہم خدا کے دیئے ہوئے قانون کو
نافذ کرنے کیلئے آزاد ہوں اور اس تہذیب کی پیروی
کرنے کیلئے آزاد ہوں جو اللہ اور اس کے رسول محمدؐ
نے ہم کو دی ہے اگر اس لحاظ سے ہم آزاد نہ ہوں
تو ہماری آزادی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے ۔

(مودودیؒ)

نقوش حیات نو

		صفحہ
اداریہ		
اصلاح معاشرہ	محمد اسمٰعیل فلاحی	۲
بحث و نظر		
برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم	پروفیسر خورشید احمد	۸
اندلس میں عربی زبان و ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر محمد احمد فلاحی	۲۳
قادیانیت ۔ طریقہ کار ۔ انسدادی تدابیر	نظر الحسن فلاحی	۲۸
قصہ ابن نوح علیہ السلام کے تربیتی پہلو	ابن محمد فلاحی	۴۰
تعارف و تبصرہ		
عقیدہ اسلامی	عبدالبر اثری فلاحی	۴۸
شعر و نغمہ		
غزل	جمشید عالم زاہد	۷

اللہ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو بلریا گنج

جلد:- ۱۰ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ اگست ۱۹۹۴ء شمارہ:- ۷-۸

بدل اشتراک		مدیر مسئول
سالانہ زر تعاون	۵۰ر روپے	نور محمد فلاحی
طلبہ کیلئے	۴۰ر "	مدیر
خصوصی "	۱۰۰ر "	محمد اسمٰعیل فلاحی
اعزازی "	۱۰۰۰ر "	معاون مدیر
غیر ممالک سے زر تعاون	۲۵ر امریکی ڈالر	عبدالبر اثری فلاحی
قیمت فی شمارہ	۵ر روپے	

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

:- ترسیل زر کا پتہ :-

دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی)

فون: ۱۵۱۱۵ / ۲۷۹۱۳

نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ ــــ کتابت: محمد اشفاق عالم مفتاحی

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

اصلاح معاشرہ

اسلام ایک دائمی حقیقت اور ایک ایسی صداقت ہے جس کا پہلا مخاطب ہوش و حواس کا کوئی فرد بشر انکار نہیں کر سکتا۔ یہ انسانی فطرت کی صدائے بازگشت اور انسان کے اندر سے اٹھنے والی وہ آواز ہے جس کی جانب اس کا دل بے اختیار کھنچتا اور بے تابانہ لپکتا ہے، لیکن اس راہ کا حجاب اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور اس راستہ کا سب سے بڑا پتھر مسلمان ہیں۔ وہ اس امانت کے امین بنائے گئے تھے لیکن خیانت کے مرتکب ہوئے اور مسلسل ہو رہے ہیں ان پر قرآن کی بیان کردہ یہودیوں کی تمثیل چسپاں ہو رہی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (الجمعۃ: ۵)

وہ جن پر تورات لادی گئی پھر وہ اس کے حامل نہیں ہوئے ان کی مثال بالکل گدھے کی سی ہے جو موٹی موٹی کتابیں ڈھوتا ہے کتنی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور اللہ ظالم قوم کو راہ یاب نہیں کرتا

"وہ اس کے حامل نہیں ہوئے" (ثم لم یحملوھا) کا مطلب ہے انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا، وہ اس پر عمل نہیں کر سکے اور ان کی زندگیاں توریت کی ترجمان بننے کے بجائے سمت مخالف کی طرف رہنمائی کرنے لگیں۔ اس آیت کو سامنے رکھئے پھر مسلمانوں کو دیکھئے۔ اسی بے عملی کا نتیجہ تھا کہ اہل کتاب غضب الٰہی کا شکار ہوئے حالانکہ اگر وہ اپنی کتاب کا حق ادا کرتے تو ان سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوتا؟

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (المائدۃ: ۶۶)

اگر یہ لوگ توریت کی، انجیل کی اور جو کچھ انکے رب کی جانب سے انکی جانب اتارا گیا ہے، اسکی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔ ان میں ایک جماعت راست رو ہے زیادہ تر ان میں ایسے ہیں کہ انکے کردار بہت برے ہیں۔

قرآن نے بڑی تفصیل سے یہودیوں کی عہد شکنی اور ان کے جرائم کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر وہ اس بات کے مستحق نہیں رہے کہ نبوت و کتاب کا سلسلہ ان میں باقی رہے۔ ان سے دنیا کی امامت اور پیشوائی لے لی گئی اور اس نئی امت امت مسلمہ کے حوالہ کی گئی لیکن اس تنبیہ کے ساتھ کہ

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (البقرۃ: ۱۵۲)

مجھے یاد رکھنا میں تمہیں یاد رکھوں گا میرے شکر گزار رہنا میری ناشکری نہ کرنا

"مجھے یاد رکھنا میں تمہیں یاد رکھوں گا" کا مطلب ہے ایمان لا کر مجھ سے کئے گئے قول و قرار کو یاد رکھنا اور اپنے عہد کو نبھانا تو میری بشارتیں تمہارے ساتھ ہونگی اور میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اللہ کی معیت، اس کی حفاظت، اس کی تائید و نصرت سب کچھ موقوف ہے اس بات پر کہ ہم اپنے عہد کو کس حد تک نبھاتے ہیں لیکن اگر ہم من مانی کی، عہد الٰہی کو بھلا دیا، ایک حکم کو لیا اور دوسرے کو نظر انداز کر دیا، مثلاً عقائد کو لیا عبادات کو چھوڑ دیا، یا عبادات کو بھی اختیار کیا، معاملات سے صرف نظر کر لیا تو نہ صرف یہ کہ تائید الٰہی سے ہم محروم ہونگے بلکہ دنیا میں رسوائی ہمارا مقدر ہوگی اور آخرت میں عذاب شدید سے ہم دوچار ہونگے۔ اہل کتاب کی اسی طرح کی من مانی روش پر قرآن نے انہیں تنبیہ کی کہ کتاب الٰہی کے آسان اور من پسند حکم کو تم مانتے ہو اور جس میں دشواری ہوتی ہے اسے ٹھکراتے ہیں یا ذوق پر گراں گزرتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو۔

❊

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزآء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (البقرۃ : ۸۵)

تو کیا کتاب کے بعض جز پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو تم میں جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا تو بس دنیوی زندگی میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن یہ لوگ سخت ترین عذاب کی طرف پلٹائے جائیں گے۔

کتاب الٰہی کے بعض حصہ پر عمل کرنا اور بعض پر عمل نہ کرنا در اصل بعض پر ایمان لانا اور بعض کے ساتھ کفر کرنا ہے جس کا دنیوی انجام ہلاکت اور رسوائی ہے۔ جو قوم بھی خدا کی کتاب کے ساتھ یہ روش اختیار کرے گی اس کا یہی عبرتناک انجام ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہود کریں تو خزی سے دوچار ہوں اور مسلمان کریں تو اس سے بچ جائیں۔ آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، لگتا ہے آسمان ان کے خلاف پھٹ پڑا ہے اور زمین انہیں نگلنے کیلئے بیتاب ہے، کیا یہ نتیجہ اس بات کا نہیں کہ ہم نے کتاب الٰہی کے ساتھ یہود کی سی روش اختیار کر رکھی ہے؟ یہ ذلت و نکبت، یہ رسوائی اور ہزیمت قرآن کے ساتھ ہمارے ظلم کا نتیجہ ہے۔ ہم علاج کرنا چاہتے ہیں لیکن مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر پاتے واقعہ یہ ہے کہ اس بے عملی یا بدعملی کے نتیجہ میں ہم خود اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ ہماری پوری تاریخ گواہ ہے کہ ہمیں سب سے زیادہ نقصان خود ہمیں سے پہونچا ہے، اس وقت سب سے زیادہ اور ہر چیز سے مقدم کام یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو زندگی کے معاملہ میں بغیر کسی استثناء کے بالکلیہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے حوالہ کریں اور اپنی صفوں کی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔

بڑی خوش آئند بات ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس جانب توجہ دی ہے، مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانوں کا سب سے زیادہ باوقار ادارہ ہے، اس کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ یکم مئی ۱۹۹۳ء کے مطابق اصلاح معاشرہ کا کام ملک گیر سطح پر کرنا طے پایا تھا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ کا ایک نمائندہ اجلاس اپنے

یہاں کرنے کی پیشکش کی جس کو بورڈ نے پسند کیا۔ یہ اجلاس ۳۰ اور ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ندوہ میں منعقد ہوا جس میں شرکت کا موقع ملا۔ برادر عزیز و مکرم مولانا محمد طاہر مدنی صاحب بھی ساتھ تھے۔

افتتاحی اجلاس میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے قرآن کریم کی دو آیتیں تلاوت کیں۔

یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین (البقرۃ : ۲۰۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

افحکم الجاہلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون (المائدہ : ۵۰)

تو کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے یقین کرنے والوں کے لئے۔

مولانا نے فرمایا سارا مسئلہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کا ہے، اس فرق کو پڑھے لکھے لوگ بھی بھول چکے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں جاہلیت سے بت پرستی، دختر کشی اور شراب نوشی کا تصور ہی آپاتا ہے حالانکہ خدائی ہدایت کے مقابلہ میں جو معاشرت، معیشت، رغبات اور نفرتیں ہیں وہ سب جاہلیت میں داخل ہیں، ہم سے مطالبہ جاہلیت چھوڑنے اور پورے طور سے اسلام میں داخل ہونے کا ہے۔ "کافۃ" کا تعلق داخل ہونے والوں سے بھی ہے اور جس میں داخل ہونگے اس سے بھی۔ یعنی یہ کہ سو فیصدی مسلمانوں سے سو فیصدی کا اسلام میں داخل ہونے کا مطالبہ ہے۔ کسی بڑے سے بڑے شخص کے لئے کوئی استثناء ہے اور نہ اس بات میں استثناء ہے کہ عبادات لیں گے عقائد چھوڑ دیں گے، معاملات لیں گے، عائلی قانون چھوڑ دیں گے۔ بدقسمتی سے ہم صحابہ کرام کی نمازوں کو دیکھتے ہیں، ان کی شادیوں اور تقریبات اور خانگی زندگی کو نہیں دیکھتے۔ اسلام صرف اس کا نام نہیں کہ عقائد صحیح ہیں اور نمازوں کی پابندی بھی ہے لیکن شادی کے معاملہ میں، پردہ کے معاملہ میں اور ترکہ کی تقسیم میں ہم

آزاد ہیں، لباس ٹھیک، تحفہ کھلا، گھٹنہ ڈھکا، داڑھی مناسب لیکن شادی میں زمانہ کے رسوم کی پیروی، یہ اسلام نہیں، جاہلیت ہے۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ" (النحل: ۹۰) بلاشبہ اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور فحشاء، منکرات اور بغی سے روکتا ہے، کی روشنی میں عدل کی تعریف کی کہ عدل نام ہے ہر شئی کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے کا، عدل کے معنی برابری کے نہیں کہ باپ اور بیٹے کو ایک ساتھ کھڑا کر دیں، ہر شخص کو اس کا صحیح اور واجب حق ادا کرنا عدل ہے، اور اس حق واجب سے زیادہ دینا احسان ہے۔ احسان سے محبت پیدا ہوتی اور محبت سے سماج جڑتا ہے مثال کے طور پر مہر دس ہزار ہے، اتنا دینا عدل ہے۔ اور پندرہ ہزار دینا احسان ہے۔ اسی طرح شوہر غریب ہے اور عورت آٹھ ہزار کر دے تو یہ احسان ہے۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے بہن کو ترکہ دینے، بیویوں کے درمیان عدل کرنے، اور صرف ایک ہی پر اکتفا کرنے، شادیوں کو فضول خرچی اور رسمِ دین سے پاک رکھنے اور مہر کی ادائیگی پر بہت زور دیا۔ اسمگلنگ، ڈرگس، لاٹری کی قباحتیں بیان کیں، ذات برادری کا نسل و رنگ اور مسلک کے جھگڑوں سے ڈرایا اور کہا یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں، لوگ کہتے ہیں بہن بیٹی نہیں لیا کریں، آپ ترکہ تقسیم کر کے حوالے کیجئے قبضہ دلا دیجئے پھر اگر وہ لوٹا دے تو ٹھیک ہے۔ بارات میں لڑکی والا اگر دس آدمی چاہتا ہے آپ پچاس لے گئے تو چالیس آدمیوں کا کھانا غلط ہے۔

امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے فرمایا نوے کروڑ کی آبادی والے اس ملک ہندوستان میں پندرہ کروڑ مسلمان ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اسلام کی صحیح نمائندگی کی ہوتی تو اس ملک کی پوری آبادی مسلمان ہوتی۔ جب چاہیں تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ آج ہندوستان کے اندر ہی نہیں، ساری دنیا میں مسلمان نہایت نازک حالات سے گزر رہے ہیں، جسمانی وجود ہی نہیں، ایمانی اور روحانی بقا کا

مسئلہ ہے۔ مولانا نے فرمایا اصلاح معاشرہ کی یہ تحریک صرف نکاح و طلاق کے الجھے ہوئے مسائل تک محدود نہیں۔ اسلامی معاشرہ وجود میں لائیے، خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہونچانے میں سرگرم ہو جائیے۔ ہمیں باہر سے زیادہ اپنے اوپر نظر ڈالنی چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی کوتاہیوں پر نگاہ رکھیں اور دوسروں کی خوبیوں کو دیکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ صرف اپنے محاسن ہی پر نظر رہے ہیں امیر جماعت نے متنبہ کیا کہ ضروری ہے کہ یہ تحریک عملی تحریک ہو۔ اس کے کارکن مخلص اور اس کا عملی نمونہ ہوں۔

دو دنوں تک یہ اجلاس چلتا رہا جس سے بہت سے علماء اور دانشوروں نے خطاب کیا۔ آخر میں کچھ تجویزیں پاس ہوئیں۔

اجلاس نے مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ نکاح سنت کے مطابق کریں۔ لین دین اور گھوڑے جوڑے کی رسم ختم کریں۔ مہر کی تعیین میں فریقین کے مالی حالات کا لحاظ ہو سکے کی قیمت گھٹتی رہتی ہے اس لئے یہ مہر ہو چاندی کی شکل میں ہو، مورث کے انتقال پر ترکہ کی فوراً تقسیم ہو، خواتین اور نابالغ اولاد کو ان کا پورا حصہ دیا جائے۔ لاٹری، جوا، چرس، ڈرگس سے دور رہا جائے، تعلیم کی طرف خصوصی توجہ ہو، ذات برادری، صنعت و حرفت اور وطن کی بنیاد پر تفریق سے پرہیز کیا جائے۔ تجاویز میں یہ بات بھی آئی کہ مسلمانوں کو نہ صرف ملت بلکہ برادران وطن کے معاشرے کی اصلاح کے لئے بھی منظم جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دوسرا ہندو ہو یا مسلمان یا کسی مذہب کی ہو اس کے جہیز یا کسی وجہ سے نذر آتش کئے جانے سے پورے معاشرے پر اثر پڑتا ہے۔ خدا کرے یہ اجلاس نتیجہ خیز ثابت ہو۔

غزل

جمشید عالم زاہد متعلم عربی سوم

کسی مظلوم کو بیکار ستایا نہ کرو — شہر میں غیر کے مکانوں کو جلایا نہ کرو

حوصلہ دل میں نہ ہو پھر کہ سنبھلنے کا اگر — جام ہونٹوں سے کبھی اپنے لگایا نہ کرو

پھولوں کی سیج ہو یا دار و رسن ہو کوئی — بات اسلام کی ہرگز چھپایا نہ کرو

کھینچ تلوار کبھی میدان میں اترنا سیکھو — اپنے اسلاف کی میراث گنوایا نہ کرو

لوگ ہنسنے کے سوا کچھ نہ کریں گے زاہد — زخم دل اپنا زمانے کو دکھایا نہ کرو

پروفیسر خورشید احمد

پہلی قسط

برصغیر میں

مسلمانوں کا نظام تعلیم

علم اور تعلیم کے باب میں اسلام کی تعلیمات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ روایت سے نمو پاتی ہیں۔ اسی چراغ راہ کی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کے مطالعہ سے تعلیم کی دنیا میں اسلام کا جو مخصوص کردار نظر آتا ہے، اس کے چند بنیادی پہلو یہ ہیں۔

١۔ علم اشیاء کی تعلیم سے انسان کے دنیوی سفر کے آغاز سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اولین ضرورت علم ہے اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔

٢۔ علم کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ رب السموات والارض کی ذات ہے، حقیقت اشیاء کا علم بھی اور ہدایت و ضلالت کا علم بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں۔ لیکن وحی سب سے اعلیٰ سرچشمہ علم ہے۔ نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں، مقاصد حیات سے بھی ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔ اسی سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں غلبۂ دین کی تعلیم، رب کی معرفت اور الہامی اصول ہدایت کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

٣۔ اسلام نے تعلیم کو بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں، بلکہ تمام انسانوں کی اولین اور بنیادی ضرورت (BASIC - NECESSITY) قرار دیا ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں ہے، جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو حتی کہ یونان اور چین بھی جو اپنی علمی ترقیات کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، اسکے قائل نہ تھے۔ یہ اسلام

ہی ہے، جس نے عام تعلیم اور ہر شخص کے لیے علم کا تصور پیش کیا۔

۴۔ ایک طرف اسلام نے تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیا تو دوسری طرف اس کو حاصل کرنے کی ذمہ داری فرد اور معاشرے دونوں پر عائد کی۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز سب پر فرض ہو اس کی فراہمی کی اولین ذمہ داری فرد پر جبکہ آخری ذمہ داری معاشرے اور ریاست پر عائد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز، حج اور زکوٰۃ کا قیام اسلام کے وظائف میں شامل ہے، تعلیم کے سلسلے میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روایت قائم کی، وہ اصحاب صُفّہ کی درس گاہ میں نظر آتی ہے۔ اصحاب صُفّہ میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود ہی تگ و دو کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے اہل ثروت انکی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دل کھول کر عطیات و وظائف دیتے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود انکی ضروریات پوری فرماتے، بلکہ جب تک ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہو جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا تناول نہ فرماتے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی ہے۔

۵۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں علم اور تربیت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے اور یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں تھا کہ بحیثیت معلم کے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے وہیں تزکیہ نفوس کا کام بھی انجام دیتے۔ ہمارے تعلیمی نظام کا مخصوص مزاج ان دونوں عناصر کے حسین امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں عرف عام میں اس امتزاج کا اظہار "علم و فضل" کی اصطلاح سے ہوا ہے جو علم اور نیکی دونوں میں بڑھے ہوئے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

۶۔ ایک اور اہم چیز تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دینی زندگی کے محور مسجد سے اس کو مربوط کیا جائے مسجد نبوی میں سب سے پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد

ہیں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اسی روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔

یہ ہے ہماری مخصوص نظریاتی و تاریخی روایت۔ پہلی چار صدیوں میں باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا۔ لیکن تعلیم و تعلم کے لاکھوں حلقے صحیح پر کام کر رہے تھے، جو صُفّہ کی تعلیم گاہ میں قائم ہوئی تھی، مسجد تعلیم کا مرکز تھی اور حلقۂ درس میں قرآن و حدیث تعلیم کا ذریعہ۔ ایک ایک درس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ خود حکومت ان اساتذہ کو معقول وظائف دیتی تھی، جو اپنی کفالت آپ نہ کر سکتے تھے۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام زبردست استحکام کا حامل تھا۔ ہر سطح پر وہاں کی ضرورت کے مطابق سلسلۂ تعلیم قائم تھا، جس کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے کے ماہرین تیار ہوتے تھے۔ اس نظام کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ جس تہذیب و تمدن کے لئے یہ نظام کارکن فراہم کر رہا تھا، وہ بجلی کی سی سرعت کیساتھ ترقی کر رہا تھا۔ ایک طرف چار سو سال میں دنیا کی عظیم ترین سلطنت قائم ہو گئی تھی اور دوسری طرف اہل علم کی یہ افراط تھی کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے جن علماء کا تذکرہ ملتا ہے، انکی تعداد پانچ لاکھ سے متجاوز ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے علم کا لوہا مانا جا چکا تھا۔

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے پیمانے پر مدارس قائم ہوئے اور ان کا ایک جال پوری مسلم دنیا میں بچھ گیا۔ یہ مدارس اسلامی مملکت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کی تعداد کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

پاک و ہند میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی دعوت، دورِ رسالت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم اور عہد خلافت راشدہؓ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر بنو امیہ کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا تھا اور سندھ کے پرانے لٹریچر اور ثقافت کے مطالعے سے اس کے نقوش آج بھی نظر آتے ہیں۔

یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوا جو اپنے معتمد علیہ غلام، قطب الدین ایبک کو یہاں حکمران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں پر حکمران رہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشوونما دینے کی پوری کوشش کی۔ اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی سرگرمیوں کے مطالعے سے جو اہم چیزیں سامنے آتی ہیں، ہم یہاں پر ان کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

۱۔ تعلیم کا جو مزاج دورِ اول میں تشکیل پایا تھا، یہاں بھی اس کو بڑی حد تک قائم رکھا گیا۔ تعلیم کا مرکز دینِ اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا۔ اہل علم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں علم کی اشاعت کے ذریعے اسکی زکوٰۃ برابر نکالتے رہے۔

۲۔ برصغیر میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا۔ لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا۔ پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔ اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے، کتب خانے محض لائبریری کی حیثیت نہ رکھتے تھے، بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے۔ نیز بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

۳۔ ہرچند کہ دینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی، مگر دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔ تجارتی تعلیم کے لئے مہاجنی اسکول تھے، جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنون سپہ گری کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے تھے۔ کتابت، خطاطی، طغری نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر وغیرہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا اور وہ اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار شخص کو تیار کرتے۔ ان کے لئے باقاعدہ مدارس اور اکیڈمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسی سے نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا، اس میں اگر ایک طرف قرآن، فقہ، منطق اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ اور طبیعات اور علم ہندسہ اور جغرافیہ کو ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اس نصاب کا مقصد مسلمان حکومت کی سول سروس تیار کرنا تھا اور خصوصیت سے قضاء و عدالت کی ضروریات کی تکمیل تھا"۔

مسلمان اپنے نظام تعلیم کے مسائل پر جس ذہن سے غور کرتے تھے، اس میں جہاں یہ فکر تھی کہ ہر چیز دین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ وہاں انہیں اس کا خیال بھی تھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو وہ پوری کر رہی ہو اور جس کام کے لئے جس درجے کا علم و مہارت درکار ہے وہ فراہم کی جائے۔ اس کا اندازہ اورنگ زیب عالمگیر کی اس گفتگو سے ہوسکتا ہے، جس میں مخاطب ملا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے۔ اورنگ زیب کہا "کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی

خصائص سے روشناس کراتا، مجھے علم ہونا چاہیئے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے؟ ان کے آداب و اطوار، مذاہب اور طرز حکومت طریق جنگ وغیرہ کیا ہیں؟ وہ کون سے امور ہیں جنہیں یہ دلچسپیاں رکھتی ہیں؟ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ باقاعدہ تعلیمی کورس کے ذریعے بتایا جائے کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا؟ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں اور وہ کون کون سے اسباب و عوامل اور حوادث ہیں جن کی بنا پر عظیم تبدیلیاں اور مہتم بالشان انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں"۔

یہ ہے تعلیم کا وہ وسیع تصور جو مسلمانوں کے پیش نظر رہا ہے۔

۴۔ اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ہوئی تھی، آج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے۔ ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جہاں تعلیم صرف پنڈتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شودر کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑ جاتے تو سننے کی پاداش میں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا گرم شیشہ ڈال دیا جاتا تھا۔ ایسے علم دشمن ماحول میں ہر طرف تعلیم و تعلم کو عام کیا اور پورا ملک علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانے کے بارے میں مقریزی کی روایت ہے۔

"سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے۔ جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا۔ مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن و عالم ہوتی تھیں۔ مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی"۔

"صبح الاعشیٰ" کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ "ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدارس جاری تھے پھر یہ مدارس معمولی قسم کے مدارس نہ تھے بلکہ انہیں ایسے ایسے مدارس بھی تھے جو آج کی بہت سی یونیورسٹیوں سے بحاظ زیادہ عظیم تھے"۔ مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مورخ ضیا برنی کا یہ قول قابل نقل ہے

مؤرخ ضیا برنی کا یہ قول قابل نقل ہے۔

"دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبیٔ عمارت، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کے عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مصارف کے لئے شاہی وظائف مقرر ہیں۔ پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع و محل کے لحاظ سے "مدرسہ فیروز شاہی" کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مدرسہ کی عمارت بہت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع ہے۔ ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے ہیں۔ طلبہ و اساتذہ کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔"

عہد اورنگ زیب کا مشہور مغربی سیاح کپتان الگزنڈر ہیملٹن اپنے "سفر نامہ سندھ" میں صرف ایک شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ "وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے تھے"۔

یہ کیفیت ایک شہر ہی کی نہیں تھی بلکہ بڑے بڑے شہر کی تھی، ایک علاقے کی نہیں ہر علاقے کی تھی اور ایک دور کی نہیں مسلمانوں کے پورے دور حکمرانی کی تھی۔

مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں، تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا، اس کی سہولتیں شہر شہر، قصبہ قصبہ، دیہات دیہات، محلہ محلہ، گھر گھر پہنچی ہوئی تھیں ایسی حالت کو آج کے ماہرین تعلیم یونیورسل تعلیم کہتے ہیں۔

۵۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خالص عوامی تھا حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لئے بے پناہ روپیہ خرچ کرتی تھیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں۔ لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ کوئی ایک محکمہ ایسا نہ تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف سے کنٹرول رکھتا ہو۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں صدر الصدور کے ایک عہدے کا نام ضرور ملتا ہے اس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی نگرانی تھا۔ لیکن صرف

اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات پوری ہوں، مدرسوں کی آزاد فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ یہ نصاب تعلیم کو کنٹرول کرتا تھا۔

اس شعبے کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اچھے، باصلاحیت نوجوان نظر آئیں، ان کو افتاء اور قضاء کی ذمہ داریوں کے لئے منتخب کرے۔ مسلمانوں نے اپنے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو کنٹرول نہیں کیا۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لئے آزاد تھا۔ حتی کہ وہ مدارس جو صرف سرکاری خزانے سے قائم ہوتے تھے، وہاں بھی تعلیم، نصاب اور تدریس میں اساتذہ آزاد تھے۔

اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی تو اسے اپنی صحت اور علمی برتری کی بنا پر ہی قبول عام حاصل ہوا، لیکن ریاست کی قوت قاہرہ کے ذریعے اسے مسلط نہیں کیا گیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی تھی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی۔ اس آزادی کے باوجود فطری یگانگت کی ایسی مثال دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں مشکل ہی سے ملے گا۔

یونانیوں میں تعلیمی آزادی کی روایت تھی مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی اور شغل بنا لیا تھا، چین میں تعلیم پر خاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط تھی ہندوستان میں تو آزاد تعلیم کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قائم کیا۔ جس میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم و ضبط کو قائم رکھنے والی قوت اخلاق کی قوت تھی۔ یہ ایک بڑا منفرد اور امتیازی شان کا حامل تجربہ تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج اور اس کی قائم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے، جس سے دنیا کے دوسرے نظام ناآشنا ہیں۔

٦۔ ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیجئے کہ جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوقی کے جواب میں کہا تھا۔ ہوا یوں کہ ملک شاہ کو ایک موقع پر تعلیم پر غیر معمولی اخراجات سے کچھ تشویش ہوئی اور اس نے کہا کہ اس زرِ کثیر سے تو ایک لشکر جرار تیار ہو سکتا ہے۔" نظام الملک طوسی نے کہا کہ " اے بادشاہ تیری فوج کے تیر تو فقط چند قدم پر کام دے سکتے ہیں، لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں، اس کے تیر زمین کے سارے طول و عرض میں مؤثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سپر سے بھی نہیں رک سکتے۔" ارباب حکومت تعلیم کو ایک تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے، بلکہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لئے اسے مؤثر ترین ذریعہ سمجھتے تھے۔

قطب الدین ایبک سے سلطان التمش تک جو حکمران گزرے ہیں، انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کئے اور مساجد تعمیر کرائیں۔ فیروز تغلق کے بجٹ میں ١٣٦ لاکھ تنکہ (جو روپے کے برابر تھا) تعلیمی وظائف وغیرہ کے لئے تھا۔ لیکن اس کا تقریباً ٢٥ فیصد یعنی ٣٦ لاکھ تنکہ صرف تعلیم کے فروغ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس نے ٣٠ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچہ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔

بہمنی اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم پر کثیر رقم خرچ کر رہی تھیں۔ مغل بادشاہوں میں علم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول مصنف "تاریخ جہان جہاں" اس نے ان مدارس کو از سرِ نو تعمیر کروایا جو تیس سال سے بند پڑے تھے اور پرندوں اور جانوروں کی رہائش گاہ بن چکے تھے۔ اس نے ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا۔

اورنگ زیب نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول ایچ جی کین

(G/KEANE) کے اس نے لاتعداد اسکول اور کالج قائم کئے۔ محمد شاہ جیسے تاریخ "رنگیلا" کے نام سے جانتی ہے، تعلیم پر بے دریغ خرچ کرتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور دارالاسلام، محمد شاہ کی علمی فیاضیوں کا مرہونِ منت تھا۔

یہ تھا مسلمان حکومت کا حال، اسی روش پر مسلمان امراء اعیان حکومت، زمیندار اور دوسرے اہلِ ثروت عمل کرتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنے صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہیں۔

" پورے صوبے اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصے میں پانچ پانچ کوس زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلے پر شرفاء اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے، جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں اور انہوں نے طلب علم کا ایک جذبہ و ولولہ پیدا کر رکھا ہے۔ طلبہ گروہ در گروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں اور جہاں موقع دیکھتے ہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر بستی کے اہل توفیق ان طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو عظیم سعادت شمار کرتے ہیں۔ شاہ جہاں کا قول تھا کہ پورب شیراز مملکت ما است"

ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس تصور کو قبول نہیں کیا کہ علم ایک قابل خرید و فروخت شے ہے اور اس کی بھی اسی طرح منڈیاں ہونی چاہئیں، جس طرح آٹے چاول کی منڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ تصور مغرب کی خالص مادہ پرستانہ تہذیب کا دیا ہوا ہے۔ مسلمان اس تصور سے یکسر ناآشنا ہیں۔

پاک و ہند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی، بلکہ طلبہ کے بود و باش

اور خورد و نوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا اور جیب خرچ کے لئے غریب طلبہ کو سرکاری ذرائع سے اور امراء کی طرف سے وظائف دیئے جاتے تھے۔ کچھ مدرسے تو ایسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔ مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو ہوسٹل کا کام دیتے تھے۔

اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد اور شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ تعلیم کا محور استاد تھا استاد کی حیثیت معلم اور مربی کی تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ان کے ایثار و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ اسلام کیسے کیسے قابل رشک نمونے تیار کر سکتا ہے اور کس کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا؟ اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند" کے اس فقرے سے کیجئے کہ

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے" ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ملک العلماء مولانا عبد العلی کو منشی حیدرالدین نے بہار (بردوان) آنے کی دعوت دی اور گراں قدر تنخواہ کی پیش کش کی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ "میرے ساتھ ۴۰۰ طلبہ ہیں اور جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو میں نہیں آ سکتا۔"

۸۔ پھر طلبہ کا حال بھی یہ تھا کہ اپنے اساتذہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور سعادت مندی، روحانی ارتباط اور قلبی وابستگی کی آخری حدوں کو چھو جاتے تھے۔

۹۔ پھر اس نظام میں استاد اور شاگرد میں صرف قلبی تعلق ہی نہ تھا، بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے۔ انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو، ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں تقوی ایفائے عہد، عصمت و عفت، ایثار و قربانی، صلہ رحمی، اخلاق و مروت

ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا رول ادا کرتی تھی۔

۱۰۔ اس دور کے سماج کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں جمود نہ تھا۔ یہ نظام نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض مسجدوں کے حجرے کی زینت نہ تھے، بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانشمندی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اگر درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جا سکتا ہے، جنہیں اس نے تیار کیا اور جنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نام پیدا کیا۔

اس جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا کیسا عظیم الشان نظام قائم کیا تھا اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے وہ کتنا منفرد اور انقلابی شان کا حامل تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نظام میں چند در چند وجوہ کی بنا پر اعلیٰ تعلیم میں منطق، فلسفہ اور دوسرے معقولات نے ضرورت سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں قرآن و حدیث سے وہ زندہ ربط کم ہو گیا تھا، جو مسلم معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ سائنسی علوم میں مسلمانوں نے پاک و ہند میں اس اجتہادی بصیرت اور اختراعی ذہن کا مظاہرہ نہیں کیا، جس کا اظہار عراق اور اسپین میں ملتا ہے۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود یہ نظام نہایت ترقی یافتہ نظام تھا اور اس نے گھر گھر تعلیم کا چرچا کر دیا تھا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اس ملک کی تعلیمی ترقی انگریزوں کی مرہون منت ہے۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اٹھارویں صدی کے یورپ کے تعلیمی نظام سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ انگریزوں نے صرف یہی ظلم نہیں کیا کہ اس ملک

پر ایک اجنبی نظام تعلیم مسلط کر دیا، بلکہ ان کا ایک نہایت گھناؤنا جرم یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک وسیع و ترقی یافتہ نظام کو ختم کر کے رکھ دیا۔

انگریزوں کی آمد کے وقت تعلیمی حالت

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے نظام کی ایک اہم ترین خصوصیت عام اور مفت تعلیم تھی، تعلیمی معیار بلند تھا اور تعلیمی سہولتیں وافر تھیں۔ عہد مغلیہ کی ثقافتی ترقی کے ذکر کے بعد راولنسن (RAWLINSON) نے لکھا ہے۔

"مغلیہ ہندوستان میں ثقافت کا بلند معیار زیادہ تر وہاں کے اعلیٰ طرز تعلیم کا ہی نتیجہ تھا۔ تعلیم وہاں مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتی تھی۔"

اس دعوے کے ثبوت میں کہ کس وسیع پیمانے پر تعلیمی سہولتیں حاصل تھیں، ہم خود انگریز مورخین، سیاحوں اور عمالِ حکومت کے شہادت پیش کرتے ہیں۔ سر تھامس منرو (MUNRO) کی ۲۵ جون ۱۸۲۲ء کی تحریر وہ پہلی اہم دستاویز ہے، جس میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ

"جنوبی ہند کے علاقے میں ہر پانچ سو افراد کی آبادی میں ایک اسکول موجود ہے۔ نیز یہ کہ آبادی میں ایک تہائی حصہ (۳۳٪) کو اسکولوں کے ذریعہ تعلیم ملتی ہے۔"

بمبئی کے بارے میں آر۔ وی۔ پیرولیکر (PRULAKER) کی مرتب کردہ کتاب A SOURCE BOOK OF HISTORY OF EDUCATION IN BOMBAY PROVINCE تعلیم کی وسعت کے بارے میں ان گنت حقائق و شواہد سے پر ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۹۹ پر شہادت متعلق بہ ۱۸۳۲ء میں کہا گیا ہے کہ "کندیش کے علاقے میں ہر گاؤں میں ایک اسکول موجود ہے جو مقامی آبادی نے قائم کر رکھے ہیں۔" اسی کتاب میں بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی پانچویں سالانہ رپورٹ (۱۸۱۹) میں درج ہے کہ "ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا یورپ کی اقوام

میں ہے۔"

جہاں تک موجودہ بنگلہ دیشی علاقوں کا تعلق ہے، بنگال کے بارے میں WARD کی رپورٹ یہ ہے کہ "ہر دیہات میں ابتدائی تعلیم جس میں پڑھنا لکھنا اور حساب شامل ہے، مدارس موجود تھے۔" ایڈم کی مشہور رپورٹ کے مطابق صرف بنگال کے علاقے میں ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں ایک لاکھ مدارس موجود تھے۔"

پنجاب میں تعلیمی اوسط کے متعلق پروفیسر لائٹنر (LEITNER) نے لکھا "اس وقت کے پنجاب کے بہت سے اضلاع میں تعلیمی اوسط برطانوی عہد کے اوسط سے بلند تر تھا۔"

مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا،

"ملک (برصغیر پاک و ہند) ہمارے ہاتھوں میں آنے سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے، بلکہ ذہن و فراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے۔ ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجے کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا، اس لیے مسلمانوں کا نظام ہندوستان کے تمام دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا۔"

جنرل سلیمین (SEELEMAN) انیسویں صدی کی ابتداء میں مسلمانوں کے تعلیمی مقام و مرتبے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی، جن میں ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ تعلیم کا عام رواج ہو۔ ہر وہ شخص جسے ۲۰ روپے ماہوار کی ملازمت حاصل ہوتی ہے، عام طور پر اپنے بیٹوں کو کسی وزیر اعظم کے بیٹے کے برابر تعلیم دلواتا ہے، جو کچھ ہمارے لڑکے یونانی اور لاطینی زبانوں کی وساطت سے سیکھتے ہیں، یہاں کے نوجوان وہی باتیں عربی اور فارسی کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ سات سالہ مطالعہ نصاب کے بعد یہاں کا مسلمان نوجوان علم کی فضا خوب

گرامر، بلاغت، منطق وغیرہ سے قریب قریب اتنا ہی واقف ہو جاتا ہے، جتنا آکسفورڈ کا کوئی عالی تعلیم یافتہ نوجوان اور حیرت یہ ہے کہ یہ بھی اسی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بو علی سینا کے متعلق [illegible] سے گفتگو کر سکتا ہے۔

یہ تھی وہ علمی دنیا جو ہمارے پرانے نظام تعلیم نے آراستہ کی تھی۔ اور یہ تھا وہ تعلیمی معیار جو مسلمانوں نے اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قائم کیا تھا، انگریزوں نے جس وقت اس ملک پر قبضہ کیا ہے اس وقت یہاں کی تعلیمی دنیا پر تاریکی اور ظلمت کا نہیں بلکہ روشنی اور نور کا دور دورہ تھا، انگریزوں نے علم کی شمعوں کو گل کیا، مدارس کو بند کیا، تعلیمی اعانت و سرپرستی کے نظام کو ختم کیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی نسلوں میں یہیں ایک ناتعلیم یافتہ گروہ بنا دیا۔ اور پھر اس مظلوم قوم کیلئے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جو اسکے فکر و نظر اور ثقافت و تہذیب کو مسخ کر دے۔ پہلے اس چمن کو اجاڑا گیا اور پھر اسی جگہ ایک جنگل اگا دیا گیا۔

بقیہ: طریقہ کار انسدادی تدابیر۔

اسکی توسیع کا اصل سبب ہے اور عوام کی غربت بہترین استاد کو تنخواہ دیکر رکھنے میں مانع ہے ہم نے شدت سے محسوس کیا کہ صرف وقتی طور پر قادیانی کارندوں کو گاؤں سے نکال دینا ہی ہماری ذمہ داری نہیں بلکہ مقابلہ تک بھی کرنا ہمارا فرض ہے، جو تنظیم کے پاس وسائل کی کمی تھی اسلئے مجبوراً ادھر ادھر ہاتھ مارا ملک کے ممتاز عالم دین اور رابطہ عالم اسلامی کے رکن کے سامنے بھی حالات پیش کئے اور ضروریات رکھیں۔ لیکن کوئی حوصلہ افزا جواب نہ مل سکا۔ مجبوراً دوسرے کاموں سے ہٹا کر ہر وقتی کارکنوں کو ایسی جگہوں کی تعلیم و تربیت کیلئے رکھا گیا۔ لیکن جہالت جاہلیہ نے اسے بھی ناکام کر دیا جس کیطرف اشارہ گذر چکا ہے، جبکہ یہ ایک مستقل ضرورت ہے جسکی طرف توجہ مبذول کرنا نہایت ضروری ہے۔

مطالعہ جہاں ایک طرف قادیانی لٹریچر پڑھنے سے منع کیا گیا وہیں دوسری طرف اسلامی رسائل اور پاکیزہ لٹریچر کا بھی نظم کیا گیا، تاکہ پڑھا لکھا طبقہ حقیقت امر سے واقف ہو اور علم و یقین کی بنیاد پر اپنے آپکو اور معاشرے کو اس آلودگی سے بچا سکے۔

چند دنوں قبل قادیانیت کے موثر مقابلہ کیلئے مولوی جبرئیل نوری صاحب و دیگر علماء کی کوشش سے مجلس تحفظ ختم نبوت نیپال کا قیام عمل میں آچکا ہے جس سے اچھی امیدیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد احمد فلاحی
شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

اندلس میں عربی زبان وادب کا ارتقاء

اندلس میں عربی شاعری میں زیادہ رجحان اس طرف تھا کہ کون شاعر سب سے اچھے انداز میں بادشاہ کی تعریف کر سکتا ہے۔ یہ رجحان ملوک الطوائف کے عہد میں زیادہ تھا۔ یوسف بن تاشفین جب اہل اندلس کو عیسائی حملہ آوروں سے نجات دلانے آیا تو معتمد بن عباد نے شعراء سے کہا کہ یوسف بن تاشفین کی شان میں ایسی قصیدہ خوانی کرو کہ میری شان بھی برقرار رہے۔

مشرق کی طرح اہل اندلس کے یہاں بھی مجالس ادب کا انعقاد عمل میں آتا تھا جس میں خلفاء، امراء، وزراء سبھی شرکت کرتے تھے۔ منصور بن ابی عامر کے سلسلے میں ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک دن اہل علم سے مباحثہ و مناظرہ کے لئے مخصوص رکھتا تھا۔ اسی طرح معتمد کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اس نے شعراء کے لئے ایک مخصوص جگہ رکھی تھی جہاں کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اندلس میں چونکہ ایک لمبے عرصے تک خالص عرب ہی برسر حکومت رہے۔ اس لئے وہ اپنی عربی روایات کے مطابق عربی زبان وادب اور شاعری کا پورا ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادباء و شعراء کی تکریم ان کے یہاں خوب ہوتی تھی۔ عبدالرحمٰن الداخل شاعر اور ادیب تھا۔ اس کا لڑکا ہشام ادیب تھا، حکم عالم اور ادیب تھا، عبدالرحمٰن اوسط ادیب اور شاعر، حکم ثانی عالم و ادیب تھا اور ان کے علاوہ تقریباً تمام خلفاء، ملوک اور وزراء بھی ادب و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ادب و شاعری کا رجحان اس قدر غالب تھا کہ کسی کو حکومت کے اہم مناصب پر فائز ہونے کے لئے شاعر و ادیب ہونا لازمی تھا۔

مشرق میں جس طرح شاعری کی ایک قسم نقائض وجود میں آئی جو اموی دور

کے عربی ادب کی شاعری کا معراج تصور کی جاتی ہے، اس کی ہلکی سی جھلک اندلس کی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن شاعری کا یہ ادبی محاربہ جو اندلس میں وقوع پذیر ہوا اموی دور کے مشرقی نقائض کے ادبی معیار سے صد درجہ کم ہے۔ جریر، اخطل اور فرزدق کے مابین چلنے والا یہ ادبی محاربہ اپنی مثال آپ تھا۔ اندلس میں جو ادبی محاذ مجالس علم و ادب میں ہوتا تھا اس کی نوعیت الگ تھی۔ یہ تو ہر دور میں رہا ہے کہ شعراء و ادباء ایک دوسرے کے رقیب تصور کیے جاتے ہیں، بالخصوص درباری شعراء ایک دوسرے سے خود کو بادشاہ، امراء، وزراء اور عوام کی نظر میں برتر ثابت کرنے کے لئے ہر طرح کے ذرائع استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس طرح کی مثال جاہلی دور میں بھی ہجو کی شکل میں ملتی ہے خلفاء کے ندیم و مصاحب ایک دوسرے کو زیر کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے

مقری نے اپنی کتاب "نفح الطیب" جلد اول میں ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ منصور بن ابی عامر کی مجلس علماء و ادباء جمی ہوئی تھی۔ اس میں رؤسائے قوم کے علاوہ زبیدی، عاصمی اور ابن العریف وغیرہم موجود تھے۔ اسی اثناء میں منصور نے اہل مجلس سے کہا ایک شخص آیا ہے جسے اس بات کا زعم ہے کہ وہ تمام علوم پر قدرت رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو آزمایا جائے۔ ابو العلا صاعد نامی اس شخص سے پوچھا گیا کہ سیرافی کون تھے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میری تو ان سے ملاقات ہے اور میں نے کتاب سیبویہ انہی سے پڑھی ہے عاصمی نے اس کتاب سے متعلق چند سوالات کیے جن کا وہ جواب نہ دے سکا اور معذرت طلب کی کہ نحو میں اسے مہارت حاصل نہیں ہے۔ اس طرح اور بھی اس سے متعدد سوال کیے گئے جن کا وہ تشفی بخش جواب نہ دے سکا لیکن تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صاعد فی البدیہہ شعر گوئی میں طاق تھا۔ مثال کے طور پر اس نے منصور کی فرمائش پر ابو علی قالی کی کتاب "الامالی" کا توڑ پیش کرنے کے لئے کتاب "الفصوص" لکھی جو لغویات اور من گھڑت اور لایعنی باتوں سے پر تھی جسے علماء نے دریا برد کروا دیا۔ جب اس کی اطلاع منصور کو ہوئی تو اس وقت کے مشہور ادیب و شاعر ابن العریف نے برجستہ کہا۔

قد غاص فی البحر کتاب الفصوص وھکذا کل فصوص یغوص

منصور اور حاضرین مجلس ہنس پڑے لیکن صاعد ذرا بھی نہیں جھجکا اور اس کا جواب اسی برجستگی سے ان الفاظ میں دیا۔

الی معدنہ انما توجد فی قعر البحار الفصوص

اسی طرح کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ اہل علم کی مجلس میں منصور کو ایک وردہ کلی دی گئی تو صاعد نے برجستہ کہا۔

اتتک ابا عامر وردۃ یذکرک المسک انفاسہا
کعذراء ابصرہا مبصر فغطت باکمامہا راسہا

اندلس میں چونکہ تین مختلف قومیں آباد تھیں لیکن عربوں کو ہر لحاظ سے غلبہ حاصل تھا کیونکہ انہیں کو اقتدار حاصل تھا۔ تینوں قوموں کے اختلاط کی بنا پر شروع کے ادوار میں عربی زبان قواعد نحو و صرف سے آزاد تھی۔ بلکہ ایک محقق کے بقول تینوں زبانوں کے اختلاط سے ایک الگ زبان وجود میں آئی جسے "اللغة العامیة" کے نام سے جانا جاتا ہے یہ زبان جو تین مختلف اقوام کی زبانوں سے مل کر وجود میں آئی تھی عربیت کا پہلو اپنے اندر زیادہ سموئے ہوئے تھی۔ لیکن قواعد و ضوابط نحو و صرف اور اعراب وغیرہ کا لحاظ کئے بغیر استعمال ہوتی تھی جیسا کہ مقری نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ علم نحو و صرف اندلس میں شروع کے ادوار میں عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس پر کسی نے توجہ دی تھی۔ اسی وجہ سے تلمسانی نے لکھا ہے کہ "حتی لو ان شخصا من العرب سمع کلام الشلوبین ابی علی المشار الیہ بعلم النحو فی عصرہ الذی غربت تصانیفہ وشرقت وھو یقرأ درسہ لضحک بملء فیہ من شدۃ اللحن الذی فی لسانہ۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع کے ادوار میں چونکہ عربی نحو و قواعد کی طرف اندلسیوں نے توجہ نہیں دی تھی اسی بنا پر اس دور کی عربی زبان قواعد نحو و صرف سے آزاد تھی

بعد کے ادوار میں جب عربوں کو ہر میدان میں استحکام نصیب ہوا اور انہوں نے

اپنی سعی وجہد کے ذریعہ عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا خصوصاً مشرق سے مقابلہ کی دوڑ میں تو دیگر علوم کیساتھ علم نحو وصرف میں بھی انہوں نے پیش رفت کی جس سے قاسی اندلسیوں اور بربروں کا عربی زبان کے ساتھ اختلاط کم ہو گیا۔

صاحب "تاریخ الفکر الاندلسی" نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ علم نحو پر اندلسیوں نے شروع کے ادوار میں بھی کام کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ نام پیش کئے ہیں مثلاً زبیدی ابو علی الشلوبین ابن مالک اور ابو حیان وغیرہم۔ انکی خدمات کیا تھیں اس سلسلہ میں انہوں نے مزید تفصیل نہیں لکھی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کچھ نحوی تو تھے لیکن یہ علم اس قدر عام نہیں تھا۔

مورخین چوتھی صدی ہجری میں علم نحو کے ارتقاء کے سلسلے میں خاموش ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس صدی میں بھی خاطر خواہ تصنیفی کام علم نحو پر نہیں ہو سکا۔ البتہ پانچویں صدی ہجری کے نحویوں کا تذکرہ تقریباً تمام مورخین کرتے ہیں اس موضوع پر انکی قابل قدر تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ ابو محمد عبداللہ بن محمد (۴۴۴ھ تا ۵۲۱ھ) عبدالعزیز بن الطراوۃ، ابو القاسم السہیلی متوفی سنہ ۵۸۱ھ وغیرہ ممتاز نحویوں میں شمار کئے جاتے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح مشرق نے علم نحو کی داغ بیل ڈالی اور اسمیں گراں قدر اضافے کئے اسی طرح اہل اندلس نے بھی علم نحو کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر علم وفن میں مشرق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اکثر وبیشتر علوم وفنون کی تحصیل اور اس میں مہارت اہل اندلس نے مشرق آکر کی اور بعد میں اپنے یہاں جاکر اسے فروغ دیا چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے اندلسی نحویوں میں ابو عمرو عثمان المعروف بابن الحاجب متوفی سنہ ۶۴۶ھ ہوئے دمشق اور قاہرہ کے مدارس سے تحصیل علم کا شرف حاصل کیا۔ علم نحو پر انکی گہری نظر تھی۔ چنانچہ شہاب الدین خفاجہ نے ابن خلکان کا قول اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ "قد سألته عن مواضع فی

العربیۃ مشکلۃ فاجاب ابلغ اجابۃ" اسی طرح ابن خلکان نے متعدد سوالات کئے جن کا انہوں نے تشفی بخش جواب دیا انکی تفصیل قصۃ الادب ۲۱۸ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"الکافیہ" کی شروح لکھنے والوں میں دسویں صدی ہجری کے رضی الدین محمد بن الحسن الاستراباذی متوفی سنہ ۶۹۶ھ کی شرح کافی شہرت اور افادیت کی حامل ہے گیارہویں صدی ہجری کے مشہور نحوی عبدالقادر بغدادی متوفی سنہ ۱۰۹۳ھ نے "خزانۃ الادب شرح الکافیہ" رضی الدین سے استفادہ کے بعد لکھی۔ اندلس ہی سے متعلق محمد بن عبداللہ بن مالک مشہور نحویوں میں سے ہیں یہ اندلس سے دمشق منتقل ہوئے اور وہیں سنہ ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔ انکی تصانیف میں منظوم "الکافیۃ الشافیۃ فی النحو" اور پھر "الخلاصہ" بھی علم نحو سے متعلق منظوم تصنیف ہے۔ نثر میں انکی کتاب "الفوائد النحویہ والمقاصد النحویۃ" وغیرہ علم نحو ہی پر لکھی گئی ہیں۔ "الخلاصہ" جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور "الالفیہ" کے نام سے جانی جاتی ہے اور "الکافیۃ الشافیۃ فی النحو" تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی تشریح اور تخلیص مصنف نے خود "الخلاصہ" کے نام سے کی ہے۔

بعد کے ادوار میں ان کی مزید شروح لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر شروح لکھنے والوں میں محمد بن ناظم متوفی سنہ ۶۸۶ھ عبداللہ بن عبدالرحمن المعروف بابن عقیل متوفی سنہ ۷۶۹ھ حسن بن قاسم المصری متوفی سنہ ۷۴۹ھ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نحوی ہیں جنہوں نے علم نحو میں اور اس پر لکھی جانے والی کتابوں میں حواشی وشروح لکھ کر قابل قدر اضافے کئے ہیں۔

قادیانیت

طریقہ کار — انسدادی تدابیر

ملک نیپال کے تناظر میں

ظل الحسن فلاحی

قادیانیت، محرکات اور عقائد وغیرہ پر علماء محققین اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ اب اس پہلو پر قلم اٹھانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ اسے اسلام دشمن تحریک ثابت کیا جائے۔ جو اسلام کے لبادہ میں اپنے باطل مقاصد کے حصول کیلئے اپنے مفاسد کو عین اسلام ثابت کر رہی ہے۔ مجھے جو کچھ لکھنا ہے وہ ملک نیپال میں حکومت برطانیہ کے وفادار نبی کے سپرد کار والے جو بھولے بھالے عوام کو اسلام کے لبادے میں برطانیہ کی ذہنی غلامی پر رضامند کرنے، اس ملک میں اس کے مفادات کی حفاظت کرنے اور اسلام کو مٹانے کی ناکام جدوجہد شروع کی ہے۔ اس کے طریقہ کار کیا ہیں؟ اب تک کتنی کامیابی ملی ہے اس کی وجوہات کیا رہیں؟ کونسی انسدادی تدابیر اختیار کی گئیں اور ضرورت کس بات کی ہے، تاکہ ذی علم اور ذی شعور علماء کرام اور دانشوران اس فتنۂ دجالی کی طرف متوجہ ہوں اور جس طرح تکفیر پر اتفاق کیا ہے اسی طرح انبیاء کے یہ وارثین متحد ہو کر وقت کے انسدادی تدابیر پر غور و خوض کریں اور اس امتِ مرحومہ کو دجالی فتنہ سے محفوظ رکھنے کیلئے منظم اور پیہم عملی کوشش شروع کریں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

قبل اس کے کہ اصل موضوع پر گفتگو کروں ربطِ کلام کیلئے قادیانیت کا مختصر تعارف مناسب سمجھتا ہوں۔

قادیانیت: حکومت برطانیہ کا ایک شعبہ ہے۔ جسے عوام الناس خاص طور سے مسلمانوں کو حکومت برطانیہ کی غلامی پر رضامند رکھنے کیلئے اور اس کے مفادات کی حفاظت کیلئے قائم کیا گیا تھا اور آج جبکہ حکومت برطانیہ بظاہر سمٹ کر دو جزیروں تک محصور ہو گئی ہے اور اسلام کو مٹانے کے مشترکہ مفاد نے امریکہ اور اسرائیل کو اس تحریک کی

طرف مائل کر دیا ہے۔ اس لئے آج قادیانیت کو برطانیہ کے ساتھ ساتھ امریکہ اسرائیل اور تمام اسلام دشمن طاقتوں کی سرپرستی کا شرف بھی حاصل ہے۔ جو آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

میری ان باتوں کی تصدیق کے لئے انگریز کے ریڈی میڈ نبی کی پیش کردہ تحریریں پڑھ سکتے ہیں تاکہ کسی طرح کا ذہنی خلجان باقی نہ رہے۔ غلام احمد قادیانی انگریزی حکومت کو پیش کردہ ایک تحریر میں اپنے والد اور بھائی کی وفاداری اور خدمت گزاری کا تذکرہ کرکے انگریز کے احسانات اور اللہ کا اس پر فیضانِ کرم کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اسلئے ہم اپنی معزز گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس گورنمنٹ کے اسی طرح خیرخواہ ہیں جس طرح ہمارے بزرگ تھے ہمارے لئے بجز دعا کے اور کیا ہے سو ہم دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس گورنمنٹ کو ہر ایک شر سے محفوظ رکھے اور اس کے دشمن کو ذلت کے ساتھ پسپا کرے اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس محسن گورنمنٹ کا شکر ایسا ہی فرض کیا ہے جیسا کہ اپنا شکر کرنا۔ سو اگر ہم اس محسن کا شکر ادا نہ کریں یا کوئی شر اپنے ارادہ میں رکھیں تو ہم نے خدا کا بھی شکر ادا نہ کیا۔ کیونکہ اللہ کا شکر اور کسی محسن گورنمنٹ کا شکر جس کو خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بطور خاص نعمت کے عطا کرے در حقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں...... بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ یہ سوال انکا نہایت احمقانہ ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر ادا کرنا عین فرض ہے اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا...... سو میرا مذہب جس کو بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں دوسرے یہ کہ اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہے جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔[1]

---

[1] شہادۃ القرآن (مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ با اہتمام منشی غلام قادر صاحب فصیح نے چھاپا) ([illegible])

[2] ملاحظہ ہو ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف "قادیانیت"۔

مزید تفصیل کے لیے (۱) ملفوظات احمدیہ جلد اول صفحہ ۱۴۹ (۲) تبلیغ رسالت از غلام احمد جلد ۶ صفحہ ۶۹۔

نبوت کا تدریجی دعویٰ

اب مجھے دقیق مباحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام اور قادیانیت میں کیا فرق ہے نہ یہ موضوع بحث ہے اور نہ علماء سلف کی تحقیقات کے بعد اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مختصر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حکومت برطانیہ نے کتنی چابکدستی کے ساتھ اپنے مشنری نبی کو تدریجی دعویٰ کراتے ہوئے نبوت تک پہنچا دیا تاکہ جو لوگ دقیق مباحث کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس علمی تحریر سے استفادہ کر سکیں اور جس کو اللہ توفیق دے ہدایت حاصل کرے۔ إن الله يهدي من يشاء

مرزا غلام احمد قادیانی۔ قادیان پنجاب میں ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں یا ایک روایت کے مطابق ۱۸۳۹ء میں غلام مرتضیٰ کے گھر پیدا ہوئے ان کے والد بھی انگریز کے وفاداروں میں تھے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں سیالکوٹ میں ایک ابتدائی [illegible] میں کلرک کی خدمت انجام دی۔ وہیں تھوڑی سی انگلش پڑھی اور ایک پوسٹ کے لیے امتحان دیا لیکن ناکام ہوا تو ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ایک مناظر اسلام کی شکل میں سامنے آئے تاکہ مسلمان مایوسی کے عالم میں اس کو اپنا رہنما سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جائیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ جب کہ حساس اصحاب علم ان کی تحریر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے ۱۸۸۹ء میں بیعت لینے کا اعلان کر دیا اور ۱۸۸۹ء تک لیتے رہے ۱۸۹۱ء میں وفات مسیح کا اعلان کیا جب کہ اس سے قبل حیات کے قائل تھے[1] اور مہدی معہود اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا ایک کتاب براہین احمدیہ[2] لکھی ۱۹۰۱ء میں مرزا کے خواص اس کو نبی کہہ کر پکارنے لگے اس وقت نبی محدث کہا جاتا تھا ۱۹۰۱ء

[1] جس کی طرف اشارہ اوپر ہو چکا غلام احمد کی تحریر میں بھی ہے اور اس میں تفصیل بھی درج ہے جسے طوالت کی وجہ سے چھوڑا جاتا ہے۔

[2] قادیانیت سید ابو الحسن علی ندوی ۲۔ قادیانیت تحلیل و تجزیہ، غلام

میں مکمل نبی کہلانے لگے ۱۹۰۲ء میں مرزا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے آپ کو کرشن کا اوتار بھی کہنے لگا اور اس کے لڑکے مرزا بشیر نے اور بھی اضافہ کیا وہ رقم طراز ہے "حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے خدا سے الہام پاکر یہ دعویٰ کیا کہ میں مسلمانوں کے واسطے مہدی ہوں، عیسائیوں کے لیے مسیح ہوں اور ہندوؤں کے لیے کرشن ہوں اور دوسری قوموں کے لیے ان کا موعود ہوں"[1]

یہ تھی انگریز کے ریڈی میڈ نبی کی پرورش و پرداخت کی مختصر سرگزشت لیکن یہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جس ہوشیاری سے انگریز نے اسے وجود بخشا اسی قدر عرق ریزی کر کے اپنے محافظ مفاد فتنے کا توسیعی منصوبہ بھی تیار کیا۔ جس کا ساتھ دیگر یہود و ہنود اور دوسری اسلام دشمن طاقتوں نے الکفر ملۃ واحدۃ کی تصویر پیش کی لیکن ہم بہتر فرقہ بنانے کے لیے "واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا" کا سبق بھول گئے ہیں جس کے سبب یہ فتنہ ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

نیپال میں ورود

نیپال کی سرزمین کو قادیانیوں کی جولان گاہ بنے تقریباً نو سال ہو چکے ہیں۔ ہم نے جب نیپال کی سرزمین پر اس کا جائزہ لیا تو محترم محمد یوسف صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ اڈیسہ کا ایک ایجنٹ ۱۹۸۴ء میں کاٹھمانڈو آیا تھا جو کافی دنوں تک مسجد میں نماز پڑھتا رہا، لوگوں سے ربط و ملاقاتیں کرتا رہا۔ کچھ لوگوں کو اپنے دام میں پھنسا بھی لیا۔ لیکن جب اس کا راز کھلا تو سنجیدہ لوگوں نے علمی طریقہ سے اسلام کی حقانیت اور مرزائیت کی نحوست سمجھائی لیکن جب وہ اپنی ضرورت پر مصر رہا تو اسے مسجد سے نکال دیا اسے کاٹھمانڈو چھوڑنا پڑا۔ پھر ۱۹۸۶ء یا ۱۹۸۷ء میں دو ایجنٹ کاٹھمانڈو آئے انہوں نے ابھی کام باضابطہ شروع نہیں کیا تھا بلکہ جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ایک دن مولانا محب الرب رضوی عرف "پروفی والے مولانا" سے ان دونوں کی ملاقات محمد یوسف صاحب کی دوکان میں ہوئی۔ رضوی صاحب محمد یوسف صاحب سے پہلے

[1] تبلیغ ہدایت صفحہ ۱۴۔

بطور قرض مانگ رہے تھے۔ انہوں نے نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا تو ایک قادیانی نے روپے کی پیش کش کی، رضوی صاحب نے جواباً کہا ہم آپ کو نہیں جانتے پھر واپس کیسے کریں گے ان دونوں نے جائے قیام کا پتہ دیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اگر نہ دے سکے تو آپ میرے بھائی نہیں۔ اسی دن سے آمد و رفت اور گفت و شنید شروع ہوئی اور ایک وقت آیا کہ مولانا بروڈی نے پورے نیپال کی معلومات فراہم کر دیں اور خود قادیانیت کو برحق ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی پیش کرنے لگے جس پر محمد یوسف صاحب نے انکو سمجھایا۔ موصوف نے کچھ پتے بھی فراہم کر دیئے جن پر پرچوں کا اجراء بھی ہو گیا براٹ نگر میں بھی ایک مدت تک "بدر قادیان" آتا رہا۔

لیکن اس وقت تک منظم طریقہ سے کام نہیں ہو رہا تھا ۱۹۸۶ء یا ۱۹۸۷ء میں ظفر احمد اور مبشر احمد بیرگنج آئے وہیں یتیم خانہ کے قریب حضرت انصاری کے مکان میں کرایہ پر رہنے لگے۔ مولانا اصغر علی اور دیگر لوگوں سے تعلقات ہوتے لوگوں سے اپنا مقصد نیپالی زبان سیکھنا بتایا یہیں سے مبشر احمد براٹ نگر آ گیا جہاں ایک مدت تک بتاتا رہا کہ بیرگنج میں ہمارا کارخانہ ہے ہم خام مال اکٹھا کرتے اور وہاں بھیجتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نیپالی زبان بھی سیکھتی ہے تاکہ دعوت و تبلیغ کا کام کر سکیں جس کی طرف میرا فطری رجحان ہے۔

یہ لوگ زیادہ مدت تک فریب نہ دے سکے اور حقیقت افشاں ہو گئی اس کے بعد مخالفت بھی ہوئی لیکن یہ لوگ باضابطہ کام شروع کر چکے تھے۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

طریقہ کار

ملک نیپال میں قادیانی سرگرمیوں کے مطالعہ سے جو طریقہ کار معلوم ہو سکے ہیں اسے ذیل میں ترتیب وار ذکر کرتے ہوئے مختصر جائزہ بھی پیش خدمت ہے

الف انفرادی ملاقات

قادیانی ایجنٹ کی پہلی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ با اثر لوگوں سے ربط ہو جائے جن کو کچھ مبہم بات بتا کر کا مطالعہ کرتے ہیں اگر اس کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ زیر ربط آدمی دینی علم و شعور رکھتا ہے۔

تو اس کے زیر سایہ رہ کر اپنے عقائد کو چھپاتے ہوئے تنکار کرتا ہے جیسا کہ چھپکیاں بیرگنج نیپال میں ظفر احمد نے مولانا اصغر علی صاحب مدنی چھپکیاں اور دوسرے لوگوں پر ایک طویل مدت تک اپنی حقیقت واضح نہیں ہونے دی جبکہ مولانا اصغر علی اس گاڑی کو یتیم خانہ کے لئے استعمال بھی کرتے رہے اور وہ پورے علاقے کا جائزہ لیتا رہا۔ یہیں اسے منصور احمد مل گیا جس کے تعاون سے پرسونی بھاٹا میں اسے قدم جمانے کا موقع ملا۔ اور یہیں سے اردگرد کی بستیوں میں کام کو وسعت ملی۔ اگر ان کے تعلق کا فرد دینی معلومات نہ رکھتا ہو مگر دنیوی نام و نمود کا خواہاں اور مال و دولت کا حریص ہو۔ تو ایسے شخص پر یہ کام کرتے ہیں۔ ان کو کتابیں بطور مطالعہ دیتے ہیں۔ اپنے سالانہ اجتماع میں بھیجتے ہیں۔ ایسے ہی نفوس اس مشن کے کامیاب آلہ کار بنتے ہیں۔

لیکن جب زیر ربط آدمی دینی علم و شعور کے ساتھ حساس دل اور پرکھنے والی آنکھ بھی رکھتا ہو تو وہ اس کے فریب کو فوراً بھانپ لیتا ہے اور تحقیق کے بعد انسدادی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ نظام الدین خاں سرچھیا براٹ نگر اس کی واضح مثال ہیں۔

(ب) کتب و پمفلٹس

کام کی توسیع و استحکام کا ایک ذریعہ لٹریچر بھی ہے جو مقامی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ کبھی کبھار تعارفی فولڈرس بھی تقسیم کئے جاتے ہیں اور کتابیں خاص طور سے متاثرین کو مطالعہ کے لئے دی جاتی ہیں اور کبھی ایسے لوگوں کو بھی جن سے امید ہو کہ متاثر ہو سکتے ہیں۔

کتابوں میں خاص طور سے مرزا بشیر احمد اور بعد کے مصنفین کی تصنیفات منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔ اور مرزا غلام احمد کی تصنیفات کسی کو نہیں دیتا میں درج ذیل کتب اب تک میری نظر سے گذر چکی ہیں (۱) تفسیر صغیر (۲) چہل حدیث (۳) تبلیغ ہدایت (۴) کیا مسیح ناصری زندہ ہیں؟ (۵) کیا قادیانی سچے مسلمان نہیں؟ قادیانی اور دوسرے کافروں میں فرق (۶) قادیانیت کے تعارفی فولڈرس (۷) نماز کے طریقے والی کتب (۸) سیرت محمد پر فولڈرس (۹) ختم نبوت کی حقیقت (۱۰) [illegible]

(۱) بدر قادیان (اخبار) (हि०) कादियानी के अखबार

(ج) علماء سے بدظنی

انفرادی ربط کے ذریعہ تعلقات کی استواری کے بعد علمائے اسلام سے بدظن کرنا پہلا کام ہوتا ہے تاکہ وہ لوگ جو دین کا خود مکمل علم نہیں رکھتے اور غیر شعوری طور پر اس کے فریبی لیبل کو دیکھ کر فریب میں آگئے ہیں ان کو علماء سے اس قدر بدظن کر دیا جائے کہ ان کی باتوں کے لئے ان کے دل و دماغ کے دروازے بند ہو جائیں اور قرآن و سنت کی روشنی میں جو بات بھی بتائی جائے اس کے لئے اس کے دل میں کوئی جگہ نہ ہو اور دن بدن ضلالت کی گڑھے کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ اس کا احساس ان کے متاثرین سے گفتگو کے درمیان بار بار ہوا۔

ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے قادیانی ایجنٹ مبشر احمد اور . . . شفا ہومیو کلینک اٹہری میں آئے۔ باتوں باتوں میں مبشر احمد نے فاذا النجوم انکدرت . . . . . . کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب علماء بدعمل ہو جائیں گے تب مسیح موعود آئیگا اور آج کے علماء ایسے ہو گئے اسی لئے وہ تشریف لائے مرزا شبیر احمد کی تفسیر بھی اسی طرح کی خرافات سے بھری ہوئی ہے۔

(د) اختلافات کو ہوا دینا

دوسری کوشش یہ ہوتی ہے (جو ان کے مقاصد میں سے ایک مقصد بھی ہے) کہ امت مسلمہ میں جو جزوی و نظری اختلافات ہیں ان کو اچھالا جائے تاکہ یہ آپس ہی میں دست و گریباں رہیں اور اپنے مقصد وجود، شہادت حق، اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف توجہ ہی نہ کر سکیں اور اللہ کی سرزمین پر باطل پرست فساد برپا کرتے رہیں۔

اسی مذموم مقصد کے لئے وہ ایسے فتاوے جن میں علماء نے مناظرانہ جوش اور جذباتی رد میں آکر   بسا اوقات فروعی اختلافات اور مہمل اعتراضات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو کافر کہہ دیا ہے ایسے تمام فتاوے کو "کیا قادیانی سچے مسلمان نہیں بجواب قادیانی اور دوسرے کافروں میں فرق" کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اسے عوام

میں پھیلا رہے ہیں۔ جس سے جہاں ایک طرف یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ اگر ہمیں یہ علماء کافر کہتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں مہمل باتوں کو لیکر ایک دوسرے کو کافر کہتے آئے ہیں اس کے باوجود کوئی کافر نہ ہوا تو ہم کیسے ہوں گے۔ وہیں دوسری طرف ایسے اختلافات کو اچھال کر ہمیں آپس میں لڑانا بھی مقصد ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(ہ) مفت تعلیم

برائی بشکل خیرخواہی ایک ایسا ہتھکنڈا ہے جسے بہت باریک بین لوگ ہی پہچان پاتے ہیں۔ قادیانیوں نے اس حربہ کو خوب استعمال کیا۔ چھپکیاں بیرگنج میں وہ تین سالوں تک اسی لئے ٹک گیا بلکہ یہی جگہ اس کے لئے نیپال میں کام کے توسیع اور استحکام کا ذریعہ بنی کہ وہاں کچھ تعمیراتی خواب دیکھ رہا تھا۔ افسوس ہے کہ ایک ذہین عالم بھی اس دام میں پھنسے رہے۔

اس کے ایجنٹ متاثرین کیساتھ یا تنہا غریب اپسماندہ اور دینی علم سے مکمل واقفیت نہ رکھنے والوں کے پاس جاتے ہیں اس سے ایک مسلمان کی حیثیت سے تعارف کراتے موجودہ دور میں علم کی اہمیت و ضرورت بتاتے ہوئے مساجد و مدارس بنانے کا منصوبہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ظفر احمد منصور احمد کے ساتھ پہلی بار پرسوئی بھیجا گیا تو وہاں کے لوگوں سے منصور احمد نے کہا کہ یہ پاکستانی ایجنسی سے آئے ہیں یہاں مدرسہ وغیرہ بنانا اور بچوں کو مفت تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ سیدھے سادے لوگ جو واقعی حاجت مند بھی تھے راضی ہو گئے اور وہاں مدرسہ کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ اسی طرح دھاتی ٹولہ، بھنسری ترسیہ، سلکپور کوسہا، مورنگ کورشی، بسن پرسا، کھاکھر پاٹولہ، گدیانی اور سکھونی جرکھیا، پرسا ناراسنی، دھنگیرھی   چلکیپور اور گورکھا میں بھی کوششیں کیں بعض جگہوں پر تعلیم شروع بھی کر دی تھی۔ جہاں دینی علوم پڑھنے کے لئے بچے نہ ملے وہاں انگلش وغیرہ وہیں ٹیوشن کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ سادی ضروریات پوری کرتے اور ہونہار بچوں کو مزید تعلیم کیلئے قادیان بھیجنے کا نظم کرتے ہیں۔

(و) بحث و مناظرہ

علماء کرام اور داعیان اسلام سے بحث و مناظرہ کا موقع

ڈھونڈتے اور مطلے پر کرتے ہیں جسمیں دلائل سے زیادہ زور بیانی، سنجیدہ گفتگو کے بجائے طعن وتشنیع سے کام لیتے ہیں۔ اپنی بات پر اڑ جاتے ہیں دلائل سننے، جواب دینے کے بجائے گفتگو کا رخ موڑنے اور نازیبا الفاظ استعمال کر کے مخاطب کو غصہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مناظرے سے ان کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کے ذریعہ تعارف کا بہترین موقع ہاتھ آتا ہے اور تشہیر اچھے ڈھنگ سے ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے عوام کی ہمدردی بٹورنے اور اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

رفتارِ کار

اللہ کا شکر ہے کہ قادیانیت نیپال میں تنزل پزیر ہے۔ اگر امت مسلمہ خاص طور سے علماء بیدار ہو جائیں تو انشاء اللہ اس کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ ذیل میں انکی سرگرمی اور فی الحال اس کی موجودہ پوزیشن کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابتداءً بلا تنخواہ امامت اور بلا معاوضہ تعلیم کا چکمہ دیکر کئی مساجد میں امامت شروع کر دی تھی۔ مثلاً کدرہا، سیہ مورنگ، کھکریاٹولہ پرسا وغیرہ میں کچھ ایام تک امامت کرتے رہے۔ لوگ دینی مجالس میں بلاتے بھی تھے فی الحال کسی مسجد میں بحیثیت امام نہیں ہیں۔ زمین کی خریداری، مکاتب کی تعمیر اور مفت تعلیم مع وظائف کی کوشش ملک کے متعدد حصوں میں قادیانی ایجنٹوں کی طرف کی گئیں جن کی تفصیل گذر چکی ہے۔ لیکن سوائے پرسونی سبجاٹا پرسا کے ابھی ملک کے کسی حصے میں قادیانی کارندے، مسلم بچوں کو تعلیم نہیں دے رہے ہیں۔ پورے ملک میں میری معلومات کی حد تک ۱۶ مسلمان قادیانیت اختیار کر چکے ہیں۔ جن میں سے تین سنسری اور بقیہ تیرہ پرسا کے ہیں۔ متاثرین کی تعداد لگ بھگ پچاس ہوگی کل گیارہ بچے قادیان میں زیر تعلیم ہیں ان میں سے ایک کھناد سنسری کے بقیہ دس پرسا کے ہیں۔ کچھ بچے واپس بھی آ گئے ہیں اور پورے ملک میں تقریباً دس ہمہ وقتی کارکن کام کر رہے ہیں۔

معاون عناصر

جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو بار بار میرے ذہن میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ اس دشمن دین و

ایمان نے ایمان والوں کو اپنا دوست بنایا اور کچھ لوگوں کو ضلالت کا سودا بھی کرایا۔ کافی غور وخوض کے بعد جو اسباب سمجھ میں آئے انہیں ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ علاج ڈھونڈنے میں آسانی ہو سکے۔

(الف) غربت

غربت وافلاس سے پہچانا جانے والا ملک نیپال اور وہاں کے مسلمان جو معاشی، سیاسی، ثقافتی، تعلیمی ہر لحاظ سے پست تر ہیں اور باہر سے آنے والے ہر معاون کو خدا کا انعام سمجھتے ہیں۔ ایسے میں کہ مسلمانوں میں دین کے نام پر تعاون کرنے والے کی طرف قدرتی میلان رکھتے ہیں جبکہ دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی واقفیت نہ ہو یہ کوئی غیر متوقع امر نہیں۔ چنانچہ جہاں بھی تعاون کے نام پر یہ گئے خیر مقدم کیا گیا اور صحیح معلومات پہنچتے پہنچتے بعض لوگ دام فریب میں آگئے۔

(ب) ائمہ مساجد

غربت کیساتھ ساتھ دوسرا طرہ یہ ہوا کہ ائمہ مساجد جو کہ دینی پیشواؤں کی حیثیت رکھتے ہیں خود دین کی مبادیات تک سے ناواقفیت کی بنا پر اس فتنہ کی حقیقت کو اجاگر کرنے صحیح اسلام کو دلائل وبراہین سے سمجھانے کے بجائے خود بھی اس مسئلے میں الجھ گئے۔ جس کے سبب لوگوں کو قادیانیت سے دور کرنے کے بجائے خود سے دور کر دیا چنانچہ بعض مساجد کے عوام نے بتایا کہ معاملہ تو ہم نے امام صاحب کے سامنے رکھا تھا لیکن وہ مطمئن نہ کر سکے۔ بعض ائمہ سے جب میں نے خود قادیانیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر سہاگا کا کام ائمہ مساجد کے افلاس اور بدعملی نے کیا اور قادیانیوں کو خزانہ کا محافظ ہاتھ آگیا اتنا ہی نہیں بلکہ بعض محافظوں نے لوٹ مار میں شرکت کی اور وہ امام صاحب جو کل تک مسجد کے امام اور مکتب کے استاد تھے آج چند ٹکے کے بدلے قادیانیت کے پرچار پرسار میں لگ گئے۔

(ج) دعوتی کام کی کمی

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہی وجود بخشا تھا۔ یہ اپنا فرض منصبی

غافل ہو گئی تو صرف پیش قدمی ہی نہیں رکی بلکہ اپنی حفاظت بھی مہنگی ہو گئی اگر آج اصلاح کا کام ہوا ہوتا تو مسلم معاشرے میں اس کو جگہ نہ ملتی ۔

(د) مسلکی ونظریاتی تعصب

مسلکی تعصبات نے بھی اسے کسی حد تک تقویت پہنچائی ہے مثلاً کہ سماور نگر میں جب قادیانی کارندے زمین کی خریداری، مدرسہ کی تعمیر اور بچوں کی تعلیم شروع کرنے جا رہے تھے اور گاؤں کے لوگ راضی ہو گئے تھے تو گاؤں والوں کو سمجھا بجھا کر منع کیا گیا اور اس کی جگہ ایک استاد رکھا گیا لیکن کچھ لوگوں نے فروعی اور جزئی معاملات کو اٹھا کر اس نو وارد استاد کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا نتیجتاً قادیانی پھر دوبارہ چڑھانے لگا اور یہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گئے۔ بڑی مشکل سے دوبارہ اسے نکالا گیا ۔

(س) جہالت

علم ہی کی بنیاد پر انسان کو خلافت عطا کی گئی تھی علم عروج کا راستہ ہے اور جہالت پستی کا زینہ ہے قرآن وسنت کی عدم واقفیت اس کی صاف اور صریح تعلیمات سے ناآشنائی اہم الاسباب ہے جو قادیانیت کے فروغ کیلئے معاون بنی کیونکہ یہی دونوں چیزیں ہیں جو ہر طرح کی خرافات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں ۔ قرآن وحدیث کو نہ جاننے والے لوگ دین کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے دین کے اجزاء کو بھی دین سمجھ لیتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ بظاہر قادیانی بھی وہی کرتے ہیں تو فریب میں آ جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں آخر یہ بھی تو نماز پڑھتے ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں آخر کیوں مسلمان نہیں ۔ اس طرح ایمان کے باوجود دین پر جماؤ نہیں ہو پاتا کیونکہ قرآن وسنت کا گہرا علم ہی انسان کو راہ راست پر قائم رکھ سکتا ہے ۔ قرآن نے صاف کہا " هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون " کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟ وحی کا آغاز ہی پڑھنے کے حکم سے ہوتا ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں " طلب العلم فريضة على كل مسلم " (مسلم) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے ۔

انسداد کی تدابیر

قادیانیت کے نیپال میں ورود کی اطلاع جامعۃ الفلاح میں

رہتے ہوئے مل چکی تھی اور ۱۹۹۲ء میں فراغت کے بعد آیا تو دیکھا کہ اس فتنہ کے انسداد کے لئے اسلامی یواسنگھ کے ذمہ داران بہت متفکر ہیں ۔ ناچیز کو اس شعبہ کی ذمہ داری سونپی گئی، کم علمی اور ناتجربہ کاری کے باوجود حالت کی نزاکت اور احساس فرض نے انکار سے زبان کو بند رکھا اور باضابطہ منصوبہ بند طریقہ سے کام شروع کر دیا جب کہ مشرقی نیپال میں دوھبی اور کھیتار وغیرہ میں کچھ مقامی علماء اور حساس عوام کوشش کر رہے تھے ہم نے ان کا ساتھ دیکر اس کام کو اور بھی مربوط کرنے کی کوشش کی ۔

اب تک کی کوششوں کی ایک جھلک ذیل میں اس مقصد سے پیش کی جا رہی ہے کہ علماء صحیح راہوں پر ہمارا ساتھ دیں اور جو خامیاں ہوں اس سے باخبر کر دیں ۔ اور مکمل صورت حال بھی سامنے آ جائے ۔

انفرادی تعلقات

سب سے پہلے ان کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا گیا ضرورت محسوس ہوئی کہ انفرادی روابط قائم کئے جائیں اور ذہنوں کی تطہیر کی جائے اس غرض سے ممکن حد تک میچی سے مہاکالی تک کے متاثرہ علاقوں میں جا کر انفرادی ملاقات کے ذریعہ ذہنی تطہیر کی کوشش کی گئی جب کہ خاص توجہ مشرقی نیپال پہ ہی رہی ۔

جمعہ کے خطبے

ساتھ ہی جہاں بھی موقعہ ملا جمعہ کے خطبے میں عوام وخواص کو اس کی زہرناکی بتانے کے لئے خطبہ دیا گیا جسمیں عقائد پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی کچھ قادیانیت کے متعلق بھی بتایا گیا اس کے علاوہ جب بھی مساجد میں مناسب موقع ملا عوام سے خطاب کیا گیا موقع بموقع جلسہ ختم نبوت کا بھی اہتمام کیا گیا ۔

پورے ملک کے عوام کو اس فتنہ سے باخبر کرنے کیلئے تمام ہی مساجد کے ائمہ کے نام ایک مختصر سا خط بھیجا گیا جس میں قادیانیت کے مختصر تعارف کے ساتھ اس فتنے سے عوام کو باخبر کرنے کی اپیل کی گئی ۔

تعلیم وتربیت کا نظم

مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ جہالت ہی

بقیہ ص ۴۲ پر

تحریر : ڈاکٹر مصطفیٰ رجب　　　ترجمانی : ابن محمد فلاحی

قصۂ ابن نوح علیہ السلام کے تربیتی پہلو

انسان جن چیزوں سے متاثر ہوتا اور عبرت حاصل کرتا ہے ان میں ایک انتہائی اہم چیز قصے اور کہانیاں ہیں ۔ ان کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم نے بھی بہت سے قصے بیان فرمائے ہیں ۔ ان ہی قصوں میں سے ایک نوح علیہ السلام کا قصہ بھی ہے جس کا مختلف مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے ۔ سردست صرف اس حصے پر گفتگو مقصود ہے جس میں نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی باہمی گفتگو نیز اس کی غرقابی کا بیان ہے ۔ کیونکہ یہ عبرت و نصیحت کے بہت سے پہلو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔ قرآن میں یہ واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ سورۃ ھود آیات ۴۱ تا ۴۷ میں مذکور ہے سب سے پہلے ان آیات پر ایک نظر ڈال لیں ۔

○ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ○ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ○ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي

اور اس (نوح) نے کہا سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی بیشک میرا رب بڑا غفور رحیم ہے کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ہر ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی نوح کا بیٹا دور فاصلہ پر تھا نوح نے پکار کر کہا بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا کافروں کے ساتھ نہ رہ ۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا ۔ نوح نے کہا آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے آخر میں ایک موج حائل ہو گئی دونوں کے درمیان اور وہ

مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ○ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○

بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا ۔ حکم ہوا اے زمین اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا ۔ فیصلہ چکا دیا گیا کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم ۔ نوح نے اپنے رب کو پکارا کہا اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے ۔ جواب میں ارشاد ہوا اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے ۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے ۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے ۔ نوح نے فوراً عرض کیا اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا ○

(سورۃ ھود پ ۱۲ رکوع نمبر ۴)

ان آیات سے پہلے یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک دن رات اپنی قوم تک دعوت حق پہنچائی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ سرکشی اس قدر بڑھ گئی کہ الٹے نبی سے اس عذاب کی جلد آمد کا مطالبہ کرنے لگے جس کی انہیں نہ ماننے کی صورت میں دھمکی دی جا رہی تھی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (ھود ۳۲)

ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر سچے ہو ۔

بہر حال جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور ان سے کسی خیر کی توقع نہ رہی تو حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی کہ انھیں ہلاک کر دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور انھیں کشتی بنانے کا حکم دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی غرقابی کا فیصلہ فرما لیا تھا جب کشتی بن کر تیار ہو گئی تو آپ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس میں تمام مومنین اور ہر مخلوق میں سے ایک ایک جوڑے (نر و مادہ) کو سوار کیا۔ باقی سارے لوگ کشتی سے باہر رہے۔ ان باہر رہ جانے والوں میں سے ایک آپ کا بیٹا بھی تھا۔ البتہ آپؑ کی طرف اس کی نسبت میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ابن کثیرؒ کا کہنا ہے کہ

"اس کا نام یام تھا اور وہ نوحؑ کا چوتھا لڑکا تھا"۔ (تفسیر ابن کثیر [illegible])

بعض دوسرے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ وہ نوحؑ کا سوتیلا لڑکا تھا البتہ نوح علیہ السلام نے اس کی پرورش کی تھی اس لئے وہ آپ کیلئے بھی بیٹے کے درجے میں تھا۔ وہ علی بن ابی طالب کی قرأت سے استدلال کرتے ہیں "ونادیٰ نوحٌ ابنہا" لیکن یہ شاذ قرأت ہے جیسا کہ قرطبی نے صراحت کی ہے (دیکھئے تفسیر قرطبی ۹/۳۶)

یہ بات اس لحاظ سے بھی کمزور ہے کہ محمد بن علی اور عروہ بن زبیر نے ھا کے فتحہ کے ساتھ اسے "ابنہَ" پڑھا ہے حالانکہ انہیں کی طرف "ابنہا" کی روایت بھی منسوب ہے جیسا کہ امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر مفاتیح الغیب میں بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو (۱۷/۳۴۰) یہ قول کہ وہ نوحؑ کا سوتیلا لڑکا تھا محمد بن علی باقر اور حسن بصریؒ کا ہے

یہاں اس غلطی کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں بعض قدیم علما پڑ گئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ یہ لڑکا ولد الزنا تھا ان کا اصلی لڑکا نہیں تھا۔ استدلال یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ تحریم کے اندر نوح علیہ السلام کی اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو خائنہ قرار دیا ہے فرمایا ہے "فخانتاھما" پس انھوں نے اس خیانت کو ظاہری معنیٰ پر محمول کیا ہے امام فخر الدین رازیؒ نے ان کے اس قول کا رد

کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ انتہائی بے ہودہ بات ہے، اس قسم کی باتوں سے انبیاء کی عصمت کو بچانا نہایت ضروری ہے خصوصاً جب کہ وہ قرآن کی صراحتوں کے خلاف ہو۔ رہا اللہ تعالیٰ کا ان کے سلسلے میں "فخانتاھما" فرمانا تو اس خیانت سے وہ خیانت مراد نہیں ہے جو انھوں نے سمجھی ہے۔ کیونکہ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ وہ خیانت کیا تھی؟ تو آپؓ نے فرمایا نوح علیہ السلام کی بیوی کہتی تھی کہ "نوح مجنون" میرا شوہر پاگل ہے اور لوط علیہ السلام کی بیوی لوگوں کو ان مہمانوں کی خبر دیتی تھی جو آپ کے پاس آتے تھے (مفاتیح الغیب ۱۸/۴۳)

پس جب طوفان آیا اور زور سے شفیق باپ نے اپنے بیٹے کو پکارا کہ مومنین کیساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ یعنی یہ کہ ایمان لا کر مومنین کی صف میں داخل ہو جاؤ نجات پا جاؤ گے لیکن جوانی کے غرور اور شدت کفر نے اسے مادی سہاروں کی طرف مائل کر دیا اور وہ مادی سہاروں کو کافی سمجھنے لگا چنانچہ اس نے جواب دیا "سآوی الی جبل یعصمنی من الماء" عنقریب میں پہاڑ کی پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی سے بچا لے گا۔

لیکن نوح علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے ظاہری اور مادی اسباب آج کچھ بھی کام نہیں دے سکتے چنانچہ انھوں نے یہ حقیقت سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لاعاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم" آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے۔ لیکن بیٹے نے اس آواز پر لبیک نہیں کہا موجوں نے اسے گھیر لیا اور وہ ان کے تھپیڑے کھانے لگا۔ یہ صورت دیکھ کر محبت پدری جوش میں آئی انھوں نے پھر اللہ کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا "رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق" اے میرے رب بے شک میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے اور تو نے میرے اہل کی نجات کا بھی وعدہ فرمایا ہے اور تیرا وعدہ سچا ہوتا ہے۔

پس صدائے حق گونجی ۔ اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ تمہارے اہل وہ لوگ نہیں جو تمہارے گھر والے اور تمہارے رشتہ دار ہیں بلکہ تمہارے اہل تمہارے لائے ہوئے دین پر چلنے والے ہیں ۔ اور اس لڑکے نے برا عمل کیا ہے یا یہ کہ تمہاری یہ درخواست غلط ہے پس تم ایسی چیزوں کی درخواست کرنے سے بچو جن کا تمہیں علم نہیں ہے تاکہ جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ ۔ چنانچہ جب انہیں صحیح راہ سجھائی دے گئی انھوں نے اپنے رب سے توبہ و استغفار کیا کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری، پانی خشک ہو گیا اور کاروبار زندگی از سر نو شروع ہو گیا ۔

نوح علیہ السلام کا یہ قصہ بہت سے تحقیقی تربیتی پہلو اپنے اندر رکھتا ہے سطور ذیل میں ان کی طرف صرف اشارات پر اکتفا کیا جائے گا ۔

(۱) ماں کے اثرات

وہ قول جس کی طرف مفسرین گئے ہیں یعنی یہ کہ یہ لڑکا نوح علیہ السلام کا سوتیلا لڑکا تھا اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب اس عورت کی شادی نوح علیہ السلام سے ہوئی تو وہ اس وقت ماں کی گود میں تھا چنانچہ آپ علیہ السلام کے گھر بھی اس کی پرورش ہوئی کیونکہ نوح ؑ کا یہ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا کہنا اس بات کیلئے کافی دلیل نہیں ہے کہ وہ آپ علیہ السلام کا صلبی لڑکا تھا کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ نبی ۔ خواہ کوئی نبی ہو اپنے سے چھوٹے کو یا بُنَیَّ کہہ کر پکارتا ہے پس جب اس کی ماں جس کے ہاں یہ پلا پوسا تھا اس دعوت کے خلاف تھی جیسا کہ سورۂ تحریم میں ہے تو کوئی بعید نہیں ہے کہ اس نے اپنے لڑکے پر منفی اثرات ڈالے ہوں ۔ اسے اپنے باپ سے دور کیا ہو اور اسے اس دعوت کا مخالف بنا دیا ہو ۔

اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باپ کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں اپنی بیوی پر کلی اعتماد نہ کرے کیونکہ عورتیں اپنی فطرت کے لحاظ سے ناقصات العقل اور ناقصات الدین ہیں، اور ان کی طرف سے یہ بات آسان ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو خواہشات نفس کے پیچھے چلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں اور یہ خطرہ اس وقت بھی ممکن ہے جبکہ باپ گھر سے زیادہ غائب رہے یا اپنے بچوں کی سرگرمیوں

سے غافل رہے ۔ یہ اشارہ بھی ہمیں سورۂ نوح سے ملتا ہے کیونکہ وہاں نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام اپنے پورا کا پورا وقت دعوت و جہاد ہی میں لگاتے تھے رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝ (نوح ۵) اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا ۔

(۲) حقیقی تعلق عقیدے کا تعلق ہے

نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی نجات کی درخواست یہ سوچ کر کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے اہل کی نجات کا وعدہ فرمایا تھا جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے وَاحْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ ۝ اور انھیں توقع تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اہل و عیال کو ضرور بچا لے گا کیونکہ اس لمحہ ان کے ذہن سے یہ جملہ معترضہ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ محو ہو گیا تھا چنانچہ جب جواباً اللہ تعالیٰ نے انھیں متنبہ کر دیا کہ یہ لڑکا بھی انہیں لوگوں میں سے ہے جن کی ہلاکت کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے ۔ وہ حقیقۃً تمہارے اہل میں سے نہیں ہے بلکہ وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے ۔ تو انھوں نے اپنی اس غلط درخواست پر مغفرت چاہی ۔

چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو قرابت داری اور رشتہ داری کے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیے خواہ یہ قرابت کتنی ہی قریبی کیوں نہ ہو ۔ ہمیشہ اس بات پر نظر رہنی چاہیے کہ جس سے دوستی کی جا رہی ہے وہ کیسا ہے اور کس قدر اس کا طور طریق ہمارے عقیدے سے میل کھاتا ہے پھر اسے اپنا بھائی سمجھنا چاہیے ۔

اسی طرح یہ بات بھی نکلتی ہے کہ باپ کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں کے سلسلے میں کسی قسم کی بے جا نرمی کو راہ نہ دے جبکہ اس کا بیٹا راہ راست سے بھٹک گیا ہو ۔ کیونکہ ایسی صورت میں قرابت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ۔

آس پاس کے ماحول کا اثر

ابنِ نوح کی اٹھان کافروں اور کافر رشتہ داروں کے درمیان ہوئی تھی چنانچہ اس کفر زدہ ماحول نے بھی

اس کی فطرت کو بگاڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر یہ بات بتائی گئی ہے اکثر لوگ نوح علیہ السلام کی دعوت کے مخالف تھے اور جو لوگ آپ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے وہ کمزور اور غریب تھے۔ پس گویا عمومی طور پر پورا ماحول فساد زدہ تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین کو برابر اس چیز پر نظر رکھنی چاہیئے کہ ان کے بچے کن لوگوں کے درمیان ہیں۔ اور رہتے ہیں کس طرح کے لوگوں سے اس کا میل ملاپ ہے تاکہ انھیں فساد زدہ ماحول سے بچا سکیں اور اچھا ماحول فراہم کر سکیں۔

(۴) محض مادی قوت کی کوئی اہمیت نہیں ہے

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے اپنی کج فہمی کی وجہ سے دھوکا کھایا کیونکہ اس نے محض پہاڑ کے بارے میں یہ گمان رکھا کہ وہ اسے پانی سے بچا لے گا حالانکہ باپ نے تنبیہ کر دیا تھا کہ بچانا صرف اللہ وحدہ لاشریک کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ اس کج فہمی کی وجہ سے گمراہی کے گڑھے میں جا گرا۔ اور ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مادی قوتیں بذات خود کسی پناہ حاصل کرنے والے کو پناہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتیں خواہ وہ جاہ ہو۔ مال ہو یا منصب وغیرہ ہو۔ کیونکہ بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ لوگ انسانوں پر ظلم کرتے ہیں انھیں ذلیل کرتے ہیں اور تکلیف پہنچاتے ہیں لیکن کچھ ہی دنوں بعد حالات ایسے بدلتے ہیں کہ وہی ظالم ذلیل اور رسوا ہوتے ہیں اور وہی مظلوم غالب و مقتدر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اعتماد اللہ پر کرنا چاہیے ان مادی قوتوں پر نہیں۔

(۵) تسلی ہے ان لوگوں کیلئے جنکے بچے بگڑ جاتے ہیں

اس قصہ میں ان لوگوں کے لیے سامان تسلی ہے جن کے بچے بگڑ جاتے ہیں جیسا کہ یہ

اللہ کی سنت ہے اور اس فطرت کا تقاضہ ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ باپ کو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے اور نہ اپنے آپ کو ہلکان کرنا چاہیے۔ اگر کسی کا کوئی لڑکا بگڑ جائے۔ بلکہ ایسے باپ کو چاہیئے کہ وہ اس پر خود دوسروں پر خصوصی توجہ دے اور یہ نہ سوچے کہ ایک لڑکے کے بگاڑ سے اس کی تربیت ختم ہو گئی۔ کیونکہ نوح علیہ السلام کا ایک بیٹا گمراہ ہوا تو تین صالح نکلے اور انھوں نے حق کے کلمہ کو بلند کیا۔

(۶) ظاہری اسباب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

کشتی بنانا اور مخلوقات کی ہر جنس کے جوڑے کو کشتی میں سوار کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام ہی معاملات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام ظاہری اسباب کو اختیار کیا جائے۔ اور یہ چیز اعتماد علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ آدمی جب بیمار ہو تو اللہ سے رجوع کرے اسی طرح جب اسے کوئی تعمیر کرنی ہو تو کسی انجینئر سے مدد لے یہ بات اس وجہ سے بھی جا رہی ہے کہ بعض لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ توکل کا تقاضا یہ ہے کہ اسی حال پر پڑے رہیں جس حال پر کہ ہیں اور معاملات کو اللہ کے حوالے چھوڑ دیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ مؤمنین کو جس طرح چاہتا نجات دیتا لیکن اس نے نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا مکلف بنایا اور وہ اس میں سالہا سال مشغول رہے جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ انسانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتا ہے کہ اسے ضرورت کے وقت ظاہری اسباب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

(۷) امید پر زندگی قائم ہے

ہر وہ مصیبت جو زندگی میں انسان کو پہنچتی ہے اگر وہ اس سے بوکھلا جائے اور ہاتھ پیر باندھ کر بیٹھ رہے تو ہلاکت کے علاوہ اسے کوئی اور چیز حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اگر وہ امید قائم رکھے تو یہی چیز اس کے اندر حرکت و عمل اور زندگی باقی رکھتی ہے۔ چنانچہ نوح نے آخری وقت تک اپنی امید نہیں توڑی یہاں تک کہ ان کے اور بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی۔ وہ آخری وقت تک اپنے بیٹے کو ایمان کی طرف بلاتے اور مؤمنین کے ساتھ سوار ہو جانے کی ترغیب سے باز نہ آئے۔ اور اسے نصیحت کرتے رہے کہ جس مادی قوت پر تم قائم ہو اور تم نے اعتماد کیا ہے اللہ کے غضب کے مقابلے میں وہ انتہائی کمزور ہے

عبدالبر اثری فلاحی

تعارف و تبصرہ

عقیدہ اسلامی | شاہ محمد عیسیٰ عثمانی فردوسی ۔ صفحات: ۲۰۸
قیمت: چالیس روپے ۔ کتابت وطباعت: اوسط

ملنے کا پتہ: مکتبہ اہل قلم 153/E 2 2 جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

یہ دور سہولت پسندی اور عقلیت کا ہے انسان ہر چیز میں آسانی چاہتا ہے اور ہر چیز کو عقل کے ترازو پر تولنے کی کوشش کرتا ہے، جو چیز اسے آسانی سے میسر آجاتی ہے اور عقلی اعتبار سے سمجھ میں بھی آجاتی ہے، اسے وہ جلد قبول کر لیتا ہے، ایسے میں ضرورت تھی کہ عقیدہ اسلامی پر سلیس زبان اور عام فہم اسلوب میں کوئی ایسی کتاب تیار کی جائے جو اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو اجاگر کرنے والی بھی ہو، الحمدللہ کہ مؤلف موصوف کو اللہ نے اس کی توفیق ارزانی کی اور انہوں نے یہ کتاب تیار کر دی اللہ انہیں جزائے خیر دے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" عقیدہ اسلامی کو سمجھنے کیلئے یہ کتاب خصوصاً کم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے انتہائی مفید ہے، غالباً انہیں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، لہذا انہیں اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔ بڑی عمدگی اور جامعیت کے ساتھ اس سلسلے کی تقریباً تمام ہی مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے البتہ ایک پہلو سے انہیں چوکنا اور بیدار رہنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ صاحب کتاب کا تعلق چونکہ سلسلہ طریقت سے ہے لہذا ان کی تحریروں میں جگہ جگہ تصوف کی آمیزش بھی نظر آتی ہے، مثلاً عالم برزخ کے احوال بیان کرتے ہوئے ص۵۴ پر لکھتے ہیں: "بزرگوں کے کشف وملاحظہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مردہ اپنی زندگی میں جس عمل و فکر میں اس دنیا میں زیادہ مشغول رہا، عالم برزخ میں بھی وہی عمل کرتا رہتا ہے جیسے یہاں وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا یہاں تک کہ قرآن حکیم سے اس کو محبت ہوگئی تھی۔ تو اس عالم میں بھی وہ تلاوت میں مشغول رکھا جائے گا۔"

یا اسی طرح ایک دوسرے مقام پر عرش عظیم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مگر صاحب شریعت کے فرمودات اور بزرگوں کے کشف و ادراک سے اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عرش عظیم کے آٹھ پائے ہیں" (ص۸۹)

ان عبارتوں سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ بزرگوں کے معائنے اور مکاشفات کی بنیاد پر کچھ عقائد بیان کئے جا رہے ہیں اور بزرگوں کا تذکرہ بطور سند اور دلیل کے کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بزرگوں کے مکاشفات کسی معاملے میں حجت نہیں بن سکتے۔ اگر مؤلف موصوف باحیات ہوتے تو اس مسئلہ پر توجہ کے لئے ان سے درخواست کی جاتی اور تفصیل سے کلام کیا جاتا ہے، لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اس لئے قاری کو تنبیہ کرنا ضروری محسوس ہوا اور کیا گیا۔ میرے خیال میں انکے لئے اتنا کافی ہے۔

بعض مقامات پر آیات و احادیث کے ترجمے میں احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔ چونکہ اس کی اصلاح آئندہ ایڈیشن میں ممکن ہے لہذا اسے کر دینا چاہئے۔ مثلاً ص۔۔ پر سورۃ الرحمن کی آیت ۳۳ نقل کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔

"یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان" اے انسانوں اور جنوں کی جماعتو! اگر تم قدرت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کی تہوں اور اسکے اطراف میں نفوذ (سلوک) کر جاؤ (تو کر جاؤ) نہیں کر سکتے مگر ہٹ دھرمی کی باتوں سے۔

اس میں "سلطان" کا ترجمہ "ہٹ دھرمی کی باتوں" کیا گیا ہے۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ لغۃً یہ معنی آتا ہے اور میرے علم کی حد تک نہ کسی مترجم نے یہ ترجمہ کیا ہے اور نہ ہی سیاق و سباق سے اس کی کوئی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

اسی طرح آیات و احادیث کے حوالے بھی ادھورے ہیں جنہیں آئندہ ایڈیشن میں مکمل کر دیا جانا چاہئے کتابت کی بعض غلطیاں بھی اصلاح طلب ہیں، انکی اصلاح بھی ہو جانی چاہئے۔

بعض مقامات پر بعض قدیم منطقی اور فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ انہیں بھی عام فہم بنا دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ آج کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے یکسر ناواقف ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس عظیم خدمت کے صلے میں مؤلف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔